مُحِبُ المسیح

سادُھو سُندر سِنگھ

کی

سرگذشت

مُصنفہ

ٹی۔ای۔رِڈل

۱۹۸۳ء

طابع ——— اے۔ این۔ والکر

مطبع ——— طفیل آرٹ پرنٹرز

بار ——— چہارم

تعداد ——— دو ہزار

قیمت ——— ۴ روپے

۱۹۸۳ء

فہرست ابواب

۱

خُدا کا طالب خُدا کو پالیتا ہے

گذشتہ صدی میں جتنے مشہور نام تاریخِ ہند کے صفحوں پر لکھنے کے قابل ہوئے اُن میں سادھو سُندر سنگھ کا نام نرالی شان سے چمکتا ہُوا نظر آتا ہے۔ بعض اشخاص نے تو خدا کی دی ہوئی قابلیت کے بل پر اُونچا مقام حاصل کیا اور بعض نے اپنی سُوجھ بُوجھ کے ذریعہ سائنس، فلسفہ، ادب یا الٰہیات میں نام پیدا کیا۔ لیکن سادھو سُندر سنگھ ان سب سے اس لیے برتر ہیں کہ اُنہوں نے زندہ خداوند کی ہستی اور موجودگی کا پُورا یقین حاصل کر کے اپنے آپ کو اس کی رہنمائی کے تابع کر دیا تھا۔ ان کا دل مسیح کی محبت سے سرشار تھا۔ اس نئی محبت نے اُن کی زندگی سے تمام خودی کو خارج کر دیا تھا۔ جس وقت وہ اپنے خداوند کی خوشی سے معمُور ہو کر پھرتے تھے تو انہیں بلاہٹ ہوتی کہ وہ خداوند کے دُکھوں میں شریک ہوں اور دوسروں سے بڑھ کر اُس کے دُکھوں میں حصّہ لیں۔ اِس صلیبی تجربے سے اُن کو ایسا اطمینان حاصِل ہُوا کہ اُن کی تمام زِندگی کچھ کی کچھ ہو گئی۔ اُن کی زندگی کے تبدیل ہو جانے کا واقعہ اِس حد تک سچّا اور دُرست ہے کہ بہت سے مُلکوں کے لوگ جب ان سے مِلتے تھے، تو انہیں یُوں محسوس ہوتا تھا گویا ان سے مل کر مسیح سے ملاقات ہو گئی۔

چُونکہ وہ اپنے خداوند کی پیروی میں ثابت قدم اور وفادار تھے،

اس لیے خدا نے اُنہیں بڑی طاقت بخشی، اور ایک ایسی رویا ان کے سامنے رکھی جو ہمیشہ ان کے دل کی کشش کا باعث بنی رہی۔ اس رویا کے ذریعہ اُنہوں نے تمام تکلیفیں اور آزمائشیں برداشت کیں جو انہیں سادھوانہ زندگی کے پہلے تیرہ سالوں کے بشارتی سفروں میں پیش آتی رہیں۔ اس کے بعد خدا نے ان سے بڑا کام لیا یعنی ان کو ایک نئی زبان دی تاکہ وہ نہ صرف اردو میں بلکہ انگریزی میں بھی اطمینان اور خوشی کا پیغام ہزاروں لوگوں کو سنائیں۔ ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۲ء تک خدا کی ہدایت و رہنمائی میں اُنہوں نے دُنیا بھر کا سفر کیا۔ مختلف قوموں نے ان کا پیغام سُنا۔ آخر کار دُکھ اور سختیاں جھیلتے جھیلتے جب ان کی صحت کو نقصان پہنچا تو خدا نے اُن کے قلم میں زور بخشا تاکہ کتابوں کے ذریعہ جن کے ترجمے چالیس سے زیادہ زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ اس پیغام کو دنیا میں کثرت سے پھیلا دیں جس سے خدا کے طالبوں کے دِلوں کو اطمینان اور تسکین حاصل ہوئی۔

سادھو سُندر سنگھ اِس لیے بڑے آدمی تھے کہ اُنہوں نے اپنی زندگی خدا کے لیے مخصوص کر رکھی تھی۔ وہ رامپور کٹانی گاؤں کے (جو اس وقت ریاست پٹیالہ میں تھا) رہنے والے تھے۔ اور اپنی ایک کتاب "بغیر مسیح اور اس کے ساتھ" میں اپنے گھر کی زندگی کا حال یوں لکھتے ہیں:۔

مَیں ایسے خاندان میں پیدا ہؤا جس میں ہندو مذہب کی تعلیم اور عمل لازمی تھا اور میری پیاری ماں اس کا زندہ اور عملی نمونہ تھیں۔ ہر صبح سب سے پہلے آپ کا کام بھگوت گیتا اور گرنتھ صاحب کی تلاوت تھا۔ اُن کی نیک زندگی اور تعلیم کا خاندان میں سب سے زیادہ اثر مجھ پر ہؤا۔ کیونکہ بچپن ہی سے اُنہوں نے میرا دستور بنا دیا تھا کہ بلا ناغہ صبح اُٹھ کر خدا سے روحانی

خوراک کے لیے دعا کروں۔ بعض اوقات میں ضد کرتا کہ پہلے ناشتہ کروں گا۔ مگر میری خدا پرست ماں نے کبھی ذرا سختی سے اور اکثر پیار سے میری یہ عادت بنا دی کہ پہلے خدا کا نام جپُوں۔ مَیں نے اُس وقت تو اُن رُوحانی باتوں کی قدر و منزلت نہ جانی۔ لیکن اب جب کبھی خیال آتا ہے تو دِل شکر گزاری سے بھر جاتا ہے اور میں اپنی ماں کے لیے خدا کا شکر کرتا ہوں۔ انہوں نے خُدا کی محبّت کی تعلیم گویا دُودھ کے ساتھ مجھے پلائی اور ان کی پیاری گود میرے لیے ایک اعلیٰ درجہ کا مدرسۂ الٰہی ثابت ہوئی، اور جہاں تک اُن سے ہو سکا اُنہوں نے مجھے سادھوانہ زندگی کے ذریعہ خداوند کی خدمت کرنے کے لیے تیار کیا۔

کچھ عرصہ تک تو ماتا جی نے ہندوؤں کی کتابوں سے تعلیم دی۔ بعد میں مَیں ایک پنڈت اور ایک بزرگ سادھو سے تعلیم حاصل کرتا رہا۔ جہاں تک پنڈت جی سے ہو سکا اُنہوں نے مجھے شاستروں کی تعلیم دی۔ جب اُن کا انتقال ہو گیا تو ایک دوسرے پنڈت جی سے تعلیم پاتا رہا۔ اِس کے بعد ایک تجربہ کار سادھو سے دینی تعلیم حاصل کرتا رہا۔ یہ سادھو بہت نیک اور اُونچے خیال کا آدمی تھا۔ اِن پنڈتوں اور سادھوؤں کی تعلیم سے مجھے ذہنی تسلی تو مِل جاتی لیکن حقیقی اطمینان کے لیے رُوح تڑپا کرتی۔ اُنہوں نے جہاں تک اُن کا تجربہ تھا بڑی ہمدردی کے ساتھ بتایا اور سمجھایا۔ لیکن کوئی خاص روحانی برکت جو میری تڑپ کو تسکین دیتی۔ اُن کے پاس نہ تھی۔

مَیں اپنے دل کی بے چینی کو مٹانے کے لیے آدھی رات تک کتابیں پڑھا کرتا تھا کہ کسی طرح سے میری روحانی پیاس بجھے۔ میرے پتا جی نے

مجھے بار بار کہا کہ رات کو دیر تک پڑھنا ٹھیک نہیں۔ گھر میں دل بہلانے کے سامان موجود تھے لیکن مجھے ان سے بالکل دلچسپی نہ تھی۔ میرے پتاجی نے کئی بار کہا "تمہاری عمر کے لڑکے تو کھیل کود کے سوا اور کسی بات کا خیال ہی نہیں کرتے۔ مگر تم پر اس چھوٹی سی عمر میں روحانیت کا بھوت کیونکر سوار ہو گیا؟ اِن باتوں کے لیے ابھی بہت وقت ہے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ یہ بیماری تمہیں اپنی ماتا سے اور سادھوؤں سے لگی ہے۔"

گھر میں پڑھانے والے ہندو اور سکھ اُستاد سندر سنگھ کے سوالوں کا تسلی بخش جواب نہ دے سکتے۔ پنڈت جی کہا کرتے کہ جب تم ذرا بڑے ہو جاؤ گے اور رُوحانی زندگی کا زیادہ تجربہ اور علم حاصل ہو جائے گا تو یہ مشکلیں جاتی رہیں گی۔ گیانی جی یہی کہتے تھے کہ ان باتوں کی ابھی چنتا مت کرو۔ جب تم گیان حاصل کر لو گے تو یہ ساری اُلجھنیں سلجھ جائیں گی۔ مگر اِس سے سندر سنگھ کو اطمینان نصیب نہ ہُؤا اور ان کا دل روحانی خوراک کے لیے ترستا ہی رہا۔

جب سُندر سنگھ چودہ سال کے تھے تو ان کی ماتا جی وفات پا گئیں۔ وُہ ایک حبتی ستی عقیدے کی ہندو عورت تھیں۔ وہ تیاگ کا عقیدہ بیٹے کے دِل پر نقش کرتی رہتی تھیں۔ سُندر سنگھ بھی ماں پر جان دیتے تھے۔ وہ اپنی زندگی میں ہر جگہ ان کا ذکر بڑی محبت اور ادب سے کیا کرتے تھے۔ وہ اپنی ماں کی تعلیم کے ہمیشہ شکر گزار رہے وہ انہیں ہمیشہ سمجھایا کرتی تھیں کہ روحانی دولت دنیوی دولت سے زیادہ پیاری اور اصلی چیز ہے۔

اُسی سال سُندر سنگھ کے بھائی بھی وفات پا گئے۔ یہ بھائی انہیں

بہت عزیز تھا۔ اِن دونوں عزیزوں کی جدائی سے انہیں بہت رنج پہنچا۔ خاص طور پر یہ سوچ کر بہت مایوسی ہوتی تھی کہ اب ان سے کبھی ملاقات نہیں ہو گی۔ کیونکہ انہیں یہ معلوم نہیں تھا وہ کونسی جُون میں داخل ہوں گے، اور وہ خود کس میں۔ ہندو دھرم میں اُن کے ٹوٹے ہوئے دِل کے لیے کوئی تسلی نہ تھی، سوائے اس کے کہ کرموں کے پھل اور قسمت کے آگے سر جھکا دیں۔

سُندر سنگھ فرماتے ہیں کہ اس وقت میری زندگی نے ایک اور طرف پلٹا کھایا۔ مَیں دنیاوی تعلیم پانے کے لیے ایک پرائمری سکول میں داخل ہُوا جو اے۔ پی۔ مشن کی طرف سے کھولا گیا تھا۔ یہاں روزانہ بائبل کا سبق بھی دیا جاتا تھا۔ چونکہ مسیحیت کے خلاف طرح طرح کی غلط فہمیاں اور ہٹ دھرمی کے خیال پائے جاتے تھے، اس لیے میں نے بائبل پڑھنے سے اِنکار کیا، لیکن مسیحی اُستادوں نے پڑھانے پر زور دیا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ میں نے چوتھی جماعت سے مشن سکول چھوڑ دیا اور ساہنیوال گاؤں کے سرکاری سکول میں جا داخل ہُوا جو رام پور سے تین میل دُور ہے گو میں انجیل کی چند باتوں میں کہ "خدا محبت ہے" اور یہ کہ "میرے پاس آؤ میں تمہیں آرام دُوں گا" ایک عجیب دلی کشش محسوس کرتا تھا تو میں اِن باتوں کو جھُوٹ سمجھ کر مخالفت ہی کرتا رہا، یہاں تک کہ ایک دن دلی بےچینی کی حالت میں ۱۶ دسمبر ۱۹۰۴ء کو اپنے پتاجی اور کئی آدمیوں کے رُو برو مَیں نے انجیل کو پھاڑا اور آگ میں جلا دیا۔"

سُندر سنگھ نے اپنی اِس حرکت کا ذکر نہایت افسوس کے ساتھ کیا ہے۔ وُہ لکھتے ہیں کہ "اگرچہ اس وقت کے خیال کے مطابق مَیں نے یہ سمجھا

کہ مَیں نے ایک جھوٹے مذہب کی کتاب کو جلا کر اچھا کام کیا، لیکن اِس سے میرے دل کی بے چینی اور پریشانی زیادہ بڑھ گئی - دو دن تک بہت ابتر حالت رہی - آخر جب یہ حالت برداشت سے باہر ہو گئی تو تیسرے دن سویرے تین بجے اُٹھ کر نہایا اور آخری پرارتھنا کر کے خودکشی کی تیاری کرنے لگا - تاکہ ساری بے چینی ختم ہو جائے - مَیں نے پکّا ارادہ کر لیا تھا کہ اگر میری پرارتھنا کا کوئی جواب نہ مِلا تو صبح کی روشنی ہونے سے پہلے ریل گاڑی کے نیچے اپنا سر رکھ کر مر جاؤں گا - میری پرارتھنا یہ تھی کہ اگر خدا ہے تو اپنے آپ کو مجھ پر ظاہر کر کے درشن دے اور نجات کی راہ دکھائے۔

آخر زندہ خُدا ساڑھے چار بجے ایسے طریقے سے ظاہر ہؤا جس کا مجھے خیال تک نہ تھا - کیونکہ میرا یہ خیال تھا کہ اگر کوئی درشن ہؤا بھی تو کرشن، بُدھ یا کسی اور ہندو اوتار کی صورت میں ہوگا جن کو مَیں سچّا سمجھتا تھا - لیکن یہ بالکل خیال نہ تھا کہ مسیح جسے مَیں مُردہ سمجھتا تھا ظاہر ہو گا - وہ ایسا ظاہر ہؤا کہ میرا اندھیرا کمرہ دن کی طرح روشن ہو گیا - مَیں اس کی نورانی اور پیاری صورت اور اُس کے یہ الفاظ ہمیشہ تک کبھی نہ بھولوں گا کہ "تُو مجھے کیوں ستاتا ہے - دیکھ مَیں نے تیرے لیے اور کُل دنیا کی نجات کے لیے صلیب پر اپنی جان دی"، یہ الفاظ بجلی کی طرح میرے دل اور رُوح میں داخل ہو گئے - اور میں ایک دم اُس کے قدموں میں گر پڑا - میرا دل بے حد اطمینان اور خوشی سے بھر گیا، اور فوراً میری تمام زندگی ہمیشہ کے لیے بدل گئی - پُرانا سُندر سنگھ مر گیا اور ایک نیا مخلوق زندہ مسیح کی خدمت کے لیے پیدا ہو گیا۔"

سُندر سنگھ کا ستایا اور گھر سے نِکالا جانا

مسیح کی مکمل فرمانبرداری کے بعد مسیح سُندر سنگھ کی زندگی کا مرکز بن گیا - اب مسیح اُن کے لیے تواریخ میں گذرا ہؤا شخص نہ رہا بلکہ ایک زندہ حقیقت بن گیا تھا - کیونکہ خدا نے اپنے آپ کو مسیح کی صُورت میں اُن پر ظاہر کیا تھا - گزرے سالوں کی لگاتار رُوحانی دَوڑ دھوپ کے بعد خدا کو پا لینے سے جو اطمینان انہیں مِلا وُہ اِس قدر پُرکشش اور رُوح پرور تھا کہ وہ یہ تجربہ سب کو بتانا چاہتے تھے - وہ فرماتے ہیں :-

"کچھ دیر کے بعد مَیں اپنے پتا جی کے پاس گیا جو ابھی سو ہی رہے تھے اور جگا کر اس درشن کا ذکر ان سے کیا - اور یہ بھی بتایا کہ اب مَیں مسیحی ہُوں - اُنہوں نے کہا، کہ تم کیا باتیں کر رہے ہو؟ ابھی تین ہی دن ہوئے کہ تم نے اُن کی کتاب کو جلایا تھا - جاؤ جا کر سو جاؤ - احمق نہ بنو! یہ کہہ کر کروٹ بدل لی - اس کے بعد میں نے جو کچھ بھی دیکھا تھا - سارے خاندان کو بتایا اور کہا کہ میں اب مسیحی ہوں - بعض کہنے لگے کہ سُندر پاگل ہو گیا ہے - بعض نے کہا، نہیں! اُس نے خواب دیکھا ہو گا - لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ مَیں اپنی دُھن میں پکّا ہُوں تو مجھے ستانا شروع کر دیا - مگر ان کا ستانا اِس بے قراری کے مقابلہ میں کچھ بھی نہ تھا جو مسیح کے درشن سے پہلے ہؤا کرتی تھی جو تکلیفیں اور مصیبتیں اب شروع ہوئیں، اُن کا برداشت کرنا میرے

لیے کچھ مشکل نہ تھا۔

جب تھوڑا ستائے جانے سے اُن کا ایمان نہ ڈگمگایا تو اُن کے رشتہ داروں کو کھٹکا ہونے لگا۔ اُن کا ایک چچا مال دار آدمی تھا۔ اُس نے اُنہیں اپنے دولت کے خزانے دکھا کر کہا کہ اگر تم ہمارے ساتھ رہو گے تو یہ سب کچھ تمہارا ہی ہوگا۔ اسی طرح چھ مہینے گذر گئے۔ نابھ کی سکھ ریاست میں سُندر سنگھ کے کچھ رشتہ دار بڑے بڑے عہدوں پر تھے۔ اُن کے اُبھارنے سے نابھ کے مہاراجہ نے سُندر سنگھ کو بُلا بھیجا۔ جب بات چیت اور دلیلوں سے لڑکے کا عقیدہ بدلتے نہ دیکھا تو اس طرح لعنت ملامت کرنے لگے کہ "سُندر اب تو سکھ شیر نہیں رہا، مسیحی کُتا بن گیا ہے۔" مہاراجہ نے یہ بھی وعدہ کیا تھا کہ "اگر تو مسیح کو چھوڑ دے تو میں تجھے ایک اعلیٰ عہدہ دوں گا۔" مگر لڑکے پر نہ تو لعنت ملامت کا اثر ہُوا اور نہ دولت و عزت کے لالچ کا۔ وہ اپنے نئے ایمان پر وفاداری سے قائم رہا۔

اب سُندر سنگھ نے گھر واپس آتے ہی اپنے کیس کٹوا ڈالے۔ کیس سِکھوں کے پانچ مذہبی نشانوں میں سے ایک نشان ہے۔ اِس لیے جب اس کے باپ نے اس کے سر پر کیس نہ دیکھے تو غصہ میں آ کر لعن طعن کرنے لگا اور حکم دیا کہ سُورج نکلنے سے پہلے تم میرے گھر سے نکل جانا۔

اگلے دن سویرے ہی سُندر سنگھ صرف مسیح کی خاطر گھر سے نکل گیا۔ بے یار و مددگار، بے گھر و بے در فقط چند پیسے اور کچھ کھانا لے کر جو گھر والوں نے دے دیا تھا گھر سے چل پڑے۔ دل میں کچھ فکر نہ تھا کہ کہاں جاؤں گا۔

لیکن چلتے چلتے انہیں یاد آیا کہ روپڑ میں جو رام پور سے ۳۵ میل نہر کے کنارے اُوپر کی طرف واقع ہے کچھ مسیحی لوگ رہتے ہیں۔ وہاں ایک ہندوستانی پادری بھی تھا جس نے ہندو دھرم کو چھوڑ کر مسیح کی خاطر تمام جائداد تیاگ دی تھی، انہیں کے درمیان رہتا ہے۔ سُندر سنگھ اس طرف چل پڑے۔ نہر میں روپڑ کی طرف جاتی ہوئی ایک کشتی مل گئی جس پر وہ سوار ہو گئے۔ راستے میں انہیں بڑی بھوک لگی، اور گھر والوں نے جو کھانا دیا تھا۔ وہ کھا لیا۔ لیکن اُس کھانے میں اُنہوں نے کچھ زہر ملا دیا تھا۔ کیونکہ انہوں نے سوچا تھا کہ زندہ رہ کر بے دین اور اچھوت کہلانے سے اس کا مر جانا ہی بہتر ہے۔ یوں بھائی بندوں میں بدنام تو نہ ہوں گے۔ شام کو وہ روپڑ پہنچے۔ مگر زہر کھا جانے کی وجہ سے ان کی حالت بہت خراب تھی۔ ڈاکٹر کو بُلایا گیا۔ اس نے کہا کہ "بچنے کی کوئی اُمید نہیں"۔ جب رات ہوئی تو سُندر سنگھ نے اس تکلیف میں خدا کو یاد کیا۔ انہیں ایسے معلوم ہُوا کہ خداوند نے اپنا شفا بخش ہاتھ ان پر رکھا ہے اور پھر وہ اطمینان سے سو گئے۔ اگلی صبح جب ڈاکٹر پھر آیا تو دیکھا کہ لڑکا برآمدے میں بیٹھا دھوپ تاپ رہا ہے۔ وہ حیران ہُوا اور تعجب سے کہنے لگا، "مجھے اُمید نہ تھی کہ یہ لڑکا بچ جائے گا۔"

۳

بپتسمہ اور سادھوانہ زندگی

سُندر سنگھ بیماری سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور گرمی کی چھٹیوں سے کئی ہفتے پہلے لدھیانہ کے کرسچن ہائی سکول میں پڑھنے کے لیے داخل ہو گئے۔ ان کے رشتہ داروں نے بھی سُنا کہ اُن کا لڑکا لدھیانہ میں ہے تو وہاں آکر اُسے سمجھانا بجھانا شروع کر دیا اور بہکا پھسلا کر واپس لے جانے کی کوشش کرنے لگے۔ یہاں تک کہ ایک دفعہ تو شہر کے فسادی لوگوں کا جتھہ آدھمکا اور کہا کہ "سُندر سنگھ کو ہمیں دے دو"۔ ایسے موقعہ پر دنگہ فساد بڑھ جانے کا بہت خطرہ ہوتا ہے، اس لیے پولیس کی مدد مانگی گئی اور بات دب گئی۔ اس کے بعد ان کے والد آئے۔ بیٹے کی جدائی کے غم سے ان کی آنکھوں کے گرد گڑھے پڑھے ہوئے تھے۔ دیکھتے ہی بیٹے کو گلے سے لگا لیا۔ ماں کی حالت اور اپنی محبت کا ذکر کر کے کہنے لگے "بیٹا! مَیں تیری منت کرتا ہوں کہ تُو گھر چل"۔ باپ کی بات سُن کر سُندر سنگھ کا کلیجہ پھٹا جاتا تھا لیکن اُسی وقت اُنہیں اپنی رویا یاد آئی اور اپنے خداوند کا بخشا ہُوا اطمینان کام آیا۔ وہ باپ سے کہنے لگے کہ میں نے تو پُورے طور پر اپنے تئیں مسیح کے حوالے کر دیا ہے۔ اَب میں سکھ مذہب میں واپس نہیں جا سکتا۔ جب باپ نے یہ الفاظ سُنے، تو دل پر چوٹ لگی۔ اور نا اُمید ہو کر واپس چلا گیا۔

سُندر سنگھ سمجھے بیٹھے تھے کہ مسیح کے تمام پیروکار ضرور اس کے نقش قدم پر چلتے ہوں گے۔ لیکن بورڈنگ ہاؤس کے لڑکوں کی گری ہوئی عادتوں نے اُن کے اس خیال کو بدل ڈالا۔ جب چھٹی کے دن آئے تو وہ سپاٹو چلے گئے۔ اور جی میں خوش تھے کہ ایسی سنگت سے نکل آیا۔ وہ کئی ہفتے سپاٹو میں رہنے کے بعد لدھیانہ آئے۔ وہاں کے کرسچن ہائی سکول کے پرنسپل ڈاکٹر فائف نے سی۔ ایم۔ ایس۔ مشن کے پادری جے ریڈمین کے نام ایک خط لکھ کر انہیں کو دیا کہ وہ شملہ لے جائیں۔ اس خط میں لکھا تھا کہ "اس لڑکے کو خوب آزمالیں اور پُوری طرح تسلی کر لینے کے بعد بپتسمہ دیں"۔ سو یہ لڑکا پچیس میل پیدل سفر کر کے شملہ پہنچا۔ پادری ریڈمین نے انہیں پرکھا۔ اور پھر ڈاکٹر فائف کو چٹھی لکھی کہ "مَیں نے سُندر سنگھ کو خوب اچھی طرح پرکھ کر دیکھا۔ اس کے ایمان کا مجھ پر گہرا اثر ہُوا ہے۔ اس نے میرے ہر ایک سوال کا ٹھیک ٹھیک جواب دیا ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ اس کو مسیح کی تعلیم اور زندگی کا کافی علم ہے۔ آخر میں جب مَیں نے یہ دریافت کیا کہ مسیح کے نجات دہندہ ہونے کی بابت تمہارا ذاتی تجربہ کیا ہے؟ تو اس کے جواب سے مجھے اور بھی تسلی ہو گئی"۔

وہ نو مہینے تک لگاتار سختیاں سہتے رہے۔ آخر ۳ ستمبر ۱۹۰۵ء کو جبکہ اُن کا سولھواں جنم دن تھا، انہیں باپ بیٹے اور رُوح القدس کے نام سے بپتسمہ دیا گیا۔ بپتسمہ کے وقت انہیں اس قدر خوشی ہوئی کہ سارا دُکھ بھُول گئے اور ایسا محسوس ہُوا کہ وہ یسوع مسیح میں شانتی پا کر ایک نئے اِنسان بن گئے ہیں جو بالکل دھویا اور پاک صاف کیا گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ "تمام دنیا شانتی کا ایک ساگر ہے جس کی شیرینی میں مَیں ڈوبا جا رہا ہوں۔"

بپتسمہ پاکر سُندر سنگھ شملہ سے پھر سپاٹو واپس گئے۔ ایک مہینہ وہاں رہے اور برابر دُعا کرتے رہے کہ ان کی آئندہ زندگی کے لیے خدا اپنی مرضی ان پر ظاہر کرے۔ ذات پات کے سخت بندھن نے ان سے گھر چھڑوا دیا تھا۔ مگر اب انہیں زندہ مسیح کا زندہ تجربہ حاصل ہو چکا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ مسیح ہر وقت میرے ساتھ ہے اور مَیں اس کی حضوری میں رہتا ہُوں۔ اب اُن کے دل میں یہ اُمنگ پیدا ہوئی کہ جس دوست نے میری رُوح کو اطمینان اور خوشی دی ہے مَیں اس کا ذکر کُل دنیا کو سُناؤں۔ بپتسمہ سے پہلے اُنہوں نے پادری ریڈمین سے بھی کہا تھا کہ میرا خداوند مجھے بلاتا ہے۔ اور مجھے اس کی دعوت کا اِس قدر یقین ہے کہ اگر مجھے بپتسمہ نہ بھی ملے تو بھی مجھے بشارت کے لیے نکلنا پڑے گا۔

اِس عرصہ میں جبکہ وہ آئندہ پروگرام کی بابت سوچ رہے تھے اور کوہستانی چیڑ کے درختوں کے سناٹے میں خدا کے جواب کے منتظر تھے تو اُس وقت ماں کی سچّی محبت کی یاد اُن کے دِل میں لہرا رہی تھی۔ بار بار اس کی نصیحت کی آواز دِل میں گونجتی تھی کہ "سُندر سنگھ! اپنے بھائیوں کی طرح غافل اور دنیادار نہ بننا۔ بلکہ تیاگ اور بیراگ کی زندگی گذارنا اور سادھو بن کر خدا کی بہترین خدمت کرنا۔" ان کی ماں کے رہنما ہاتھ نے اشارہ سے وہ طریقہ بتا دیا تھا جس کو ہندوستان کے لوگ عزّت کی نگاہ سے دیکھتے چلے آئے ہیں۔ اِس لیے انہوں نے وہی طریقہ اختیار کیا۔ بپتسمہ کے ۳۳ دن بعد اُنہوں نے اپنی چند کتابوں اور کپڑوں کو بھی خیرباد کہا اور لوگیوں کا سا گیروا لباس پہن کر مسیح کی خاطر ہر روز موت کی سی زندگی بسر کرنے کو چل نکلے۔

ہلکے پھلکے ہو کر سفر کرنے کا ایک سہل سا طریقہ سادھو بننا تھا تاکہ اُس رُوحانی اطمینان کا ماجرا جو اُنہیں مسیح کے قدموں میں آکر اطاعت قبول کرنے کے بعد حاصل ہُوا تھا، سب کو سُنا سکیں۔

ہندو سادھو کی عزّت اس لیے ہوتی ہے کہ وہ اپنی رُوح کا خدا سے ملاپ کرنے کے لیے سب کچھ تیاگ دیتا ہے تاکہ اس سنگت اور ملاپ کے وسیلہ سے آواگون کے چکر سے چھٹکارا پالے۔ مگر سُندر سنگھ نے مسیح میں خدا سے ملاپ حاصل کر لیا تھا اور دنیا کی چیزوں کو ترک کر دیا، تاکہ اُس کے عرفان میں کامل اور خداوند کے جی اُٹھنے کی قوّت اور اُس کے دُکھوں میں شریک ہو جائے۔

۴

سادھوجی کا پہلا دورہ

یہ اُمید لے کر سادھوجی پہاڑ کی پتھریلی سڑکوں پر ننگے پاؤں چل پڑے۔ اُن کے پاس صرف ایک ہلکا سا کمبل اور ایک اردو کی انجیل تھی۔ سب سے پہلے وہ اپنے علاقہ میں اپنے لوگوں کو خوش خبری سنانے کے لیے پہنچے۔ اس کی بابت وہ اپنی کتاب "بغیر مسیح اور اس کے ساتھ" میں یُوں لکھتے ہیں:

"اس نئی زندگی کی ایک خاص بات یہ ہے کہ انسان دوسروں کو بھی اس زندگی کے چشمہ کے پاس لانے کے لیے مجبور اور مصروف ہو جاتا ہے لیکن لاچاری سے نہیں بلکہ خوشی سے۔ چاہے کچھ بھی ہو وہ اطمینان اور خوشی سے ساری مشکلوں پر فتح پاتا ہے۔ ایک روز میں رام پور کتانی سے کوئی دو میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں بنام چھنڈرال میں منادی کرنے کے لیے گیا۔ منادی کرتے کرتے اندھیرا ہو گیا اور رات وہیں رہنا پڑا۔ رات کے ۸ بجے کے قریب سب لوگ اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ مَیں تھکا ماندہ ہو کر ایک پیڑ کے نیچے جا لیٹا۔ میرے پاس کھانے پینے کے لیے کچھ نہ تھا اور مانگنا میرے اصول کے خلاف تھا۔ بھوک اور کمزوری نے بہت ستایا۔ شیطان بھی آزمائشیں کر رہا تھا کہ "دیکھو اپنے گھر میں تو کیسے آرام سے تھا اور اب مسیح کی خاطر کیسا محتاج اور بے سہارا ہو گیا ہے!" تو بھی

میرا دل ایسی عجیب خوشی اور اطمینان سے معمور تھا کہ مارے خوشی کے مَیں چُپ نہ رہ سکا اور آدھی رات کو خداوند کی تعریف کے گیت گانے لگا۔ لوگ جاگ اُٹھے۔ ان میں سے دو اُٹھ کر میرے پاس آ گئے۔ اور مَیں نے اُنہیں نجات دہندہ کی حقیقی خوشی کی بابت کچھ اور باتیں بتائیں۔ اُن پر بہت اثر ہُوا لیکن جب ان کو معلوم ہوا کہ مَیں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ تو وہ بہت افسوس کرنے لگے۔ اُنہوں نے اُسی وقت کھانا تیار کر کے مجھے دیا۔ مَیں نے خدا کا اور اُن کا شکریہ ادا کر کے کھایا اور دعا کر کے سو گیا۔

دوسرے دن کئی ایک گاؤں میں منادی کرنے کے بعد رام پور کتانی پہنچا۔ وہاں بھی منادی کے لیے اچھا موقع ملا۔ شام کے وقت مَیں اپنے گھر اپنے پتاجی کے پاس گیا۔ پہلے تو انہوں نے ملنے سے انکار کر دیا۔ الزام یہ تھا کہ مَیں نے مسیحی ہو کر انہیں بے عزت اور شرمندہ کیا اور خاندان کا نام بدنام کیا۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد آ کر کہا "اچھا رات کو یہاں رہ سکتے ہو۔ مگر صبح ہوتے ہی یہاں سے چلے جانا اور پھر کبھی یہاں مُنہ نہ دکھانا۔" مَیں چُپ رہا۔ رات کو کھانے کے وقت مجھے دُور بٹھا کر کھانا اور پانی دیا گیا تاکہ میں اُنہیں یا اُن کے برتنوں کو نہ چھُو سکوں۔ یہ سلوک دیکھ کر میری آنکھوں سے ...... بے اختیار آنسو بہنے لگے کہ یہی باپ جو مجھے اتنا پیار کرتا تھا۔ اب یہ سمجھ کر کس قدر نفرت کرتا ہے! تو بھی دل میں بے حد اطمینان بھرا تھا۔ اور میں نے ان کا شکریہ ادا کر کے کہا کہ "کوئی بات نہیں۔ آپ نے اُس مسیح کی خاطر مجھے چھوڑ دیا ہے جس نے میرے اور کُل دنیا کے لیے اپنی جان دی۔ میں نے مسیحی ہونے سے پہلے اپنے کاموں سے اس کی بہت بے عزتی کی تو بھی اُس نے مجھے نہ چھوڑا۔ خیر مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں۔ مَیں آپ کی محبت

کے اور اس سلوک کے لیے بھی شکر گذار ہُوں " یہ کہہ کر اور سلام کر کے میں گھر سے چل دیا اور باہر کھیتوں میں جاکر دعا اور شکر گذاری میں لگ گیا - پھر میں وہیں ایک پیڑ کے نیچے سوگیا اور اگلی صبح اُٹھ کر بشارت کے لیے دوسرے گاؤں کی طرف چل دیا -

اپنے گاؤں رام پور کٹانی میں منادی کرنے کے بعد سُندر سنگھ وسطی پنجاب میں سے ہو کر گذرے جہاں سکھوں کی آبادی زیادہ تھی - اور پھر مغربی پنجاب میں گئے جہاں مسلمان زیادہ تھے - دریائے سندھ کو پار کرنے کے بعد بلوچستان میں جا داخل ہوئے، اور پھر وہاں سے ہوتے ہوئے سرحد کے کنارے کنارے شمال کی طرف پشاور تک گئے - آگے بڑھ کر درۂ خیبر کے علاقہ میں آفریدی پٹھانوں کے مذہبی لوگوں سے واسطہ پڑا اور پھر وہاں سے نکل کر افغانستان میں جلال آباد تک چلے گئے - اس سے آگے نہیں گئے - کیونکہ وہ ان لوگوں کی زبان نہیں سمجھتے تھے -

وہاں سے جب پشاور واپس آئے تو شہر کے مسیحیوں نے دیکھا کہ وہ قرون میں بیٹھے ہیں اور پاؤں کے زخموں کے سبب ان کی حالت بہت خراب ہے - لہٰذا وہ لوگ انہیں اپنے ساتھ لے گئے اور مرہم پٹی کی - اتوار کے دن انہوں نے گرجے میں وعظ کیا اور حاضرین کو سب حال سنایا کہ کس طرح خدا نے جلال آباد میں اُن کی حفاظت کی جب اس شہر کے جوشیلے مسلمانوں نے دیکھا کہ ایک مسیحی سادھو ہمارے درمیان آیا ہے تو اس کو قتل کرنے کی تجویز سوچنے لگے - مگر ان میں سے ایک نے جو ذرا نرم مزاج تھا آکر سادھو کو خطرے کی خبر دے دی - لہٰذا وہ ایک بے چھت کی سرائے میں چلے گئے جہاں وسط ایشیا کے قافلے رین بسیرا کرنے کے لیے اکثر ٹھہرتے تھے - اس سرائے کے اندر انہوں

نے سخت سردی اور بارش میں ساری رات کاٹی - اگلی صبح جب وہ اپنے کپڑے سُکھا کر آگ تاپ رہے تھے تو پٹھانوں کا ایک جتھہ سرائے میں آیا - یہ دیکھ کر سُندر سنگھ کو بڑی حیرانی ہوئی کہ ان کا سردار پاس آیا اور ان کے پاؤں پر گر کر کہنے لگا " ہمارا ارادہ تمہیں قتل کرنے کا تھا - لیکن جب ہم نے دیکھا کہ اتنی سخت سردی سے تمہیں کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا تو ہم سمجھ گئے کہ اللہ نے تمہاری حفاظت کی ہے اور تم اللہ کے بندے ہو - انہوں نے سُندر سنگھ سے درخواست کی کہ تم ہمارے پاس رہو اور خدا کا کلام سُناؤ "

پس وہ ایک ہفتہ ان کے درمیان رہے اور ان پٹھانوں نے کھلے دل سے اپنے مہمان کی آؤ بھگت کی - اور جب انہوں نے مُردوں میں سے جی اُٹھے زندہ مسیح کی قدرت کا ذکر سُنایا تو بڑے دھیان سے سُنتے رہے - انہوں نے انہیں بتایا کہ یہ وہی زندہ خداوند ہے جس کو تم مانتے ہو کہ چوتھے آسمان پر ہے - سُندر سنگھ کہتے ہیں کہ " اس دورے سے مجھے بہت اطمینان اور تقویت ملی جو میں بھول نہیں سکتا "

۵

سفر اور کام

سُندر سنگھ صوبہ سرحد سے نکل کر پہاڑوں سے گزرتے ہوئے ریاست کشمیر میں داخل ہوئے اور پھر مشرق کی طرف شملہ تک گئے۔ ہمیں ان دنوں کے حالات اور سفر کی بابت بہت کچھ معلوم نہیں۔ ان میں انکساری بہت تھی اس لیے انہیں یہ خیال کبھی نہ آیا کہ جو مجھ پر گزر رہی ہے۔ اُس سے کبھی دنیا کو بھی کچھ دلچسپی ہوگی۔ چنانچہ انہوں نے اپنے لمبے سفروں میں نہ تو کسی جگہ کی بابت کچھ لکھا اور نہ ہی وقتوں کے متعلق کچھ یاد رکھا۔ البتہ ۱۹۱۸ء کے بعد ان کی شہرت پھیلنے لگی اور جو سختیاں اور تکلیفیں انہوں نے مسیح کی خاطر اُٹھائیں اور جو مسیحی تجربے ہوئے، لوگ اُن کے متعلق معلوم کرنے کی خواہش ظاہر کرنے لگے۔ اپنی کتابوں میں انہوں نے اپنی دلیری اور جرأت کا بیان نہیں کیا انہیں خدا سے ایسی قابلیت ملی تھی کہ جب کسی مشکل مضمون پر روشنی ڈالنا اور کسی سچائی کو ظاہر کرنا چاہتے تھے تو اپنی روزانہ زندگی سے مثالیں استعمال کرتے تھے۔ مسیح کے کفارہ کی تشریح کرتے ہوئے انہوں نے اکثر جگہ وہ ماجرا بیان کیا ہے جو کشمیر کے سفر میں پیش آیا تھا۔ وہ بیان کرتے ہیں۔

"مجھے یاد ہے کہ کشمیر میں ایک آدمی تھا جس کے پاس کئی سو بھیڑیں تھیں۔ اُس کے نوکر ان بھیڑوں کو چرانے کے لیے باہر لے جایا کرتے تھے۔ اور جب چرا کر گھر واپس لاتے تھے تو دو ایک بھیڑیں ہر روز گم ہو جاتی تھیں۔ مالک

نوکروں سے کہتا کہ جا کر تلاش کرو۔ لیکن وہ جنگلی درندوں کے ڈر سے ڈھونڈنے نہ جاتے۔ مالک کو اپنی بھیڑوں سے بہت محبت تھی۔ وہ انہیں بچانا چاہتا تھا۔ وہ دل میں سوچنے لگا: اگر میں خود ان بھیڑوں کی تلاش میں جاؤں تو بھیڑیں مجھے پہچانیں گی نہیں کیونکہ انہوں نے مجھے پہلے نہیں دیکھا۔ وہ نوکروں کو تو پہچانتی ہیں۔ مگر نوکر ان کی تلاش میں جانا نہیں چاہتے۔ خیر میں خود بھیڑ بن کر جاتا ہوں۔ یہ سوچ کر اس نے بھیڑ کی کھال لی اور اسے اوڑھ کر بھیڑ کا رُوپ دھار لیا۔ جنگل میں گیا اور جو کھو گئی تھیں مل گئیں، اور چند ایک جو زخمی ہو گئیں وہ بھی ڈھونڈ لیں۔ اِس طرح بھیڑیں اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگیں۔ انہوں نے سمجھا کہ یہ بھی ہمارے جیسی بھیڑ ہے۔ یوں انہیں گھر لے آیا۔ اس طرح جب سب کو ڈھونڈ لایا تو وہ کھال بدن سے اُتار دی۔ وہ آدمی تھا بھیڑ نہیں تھی۔ بھیڑ کا رُوپ اِس لیے دھارا تھا کہ کھوئی ہوئی بھیڑوں کو ڈھونڈ کر گھر لے آئے۔ اِسی طرح خدا بھی اِنسان نہیں۔ لیکن وہ اِس لیے اِنسان بنا کہ آدمیوں کو بچا لے۔"

اپنے لمبے سفر سے واپس آکر وہ گرمی کے موسم میں کوٹ گڑھ چلے گئے جو شملہ سے پرے ہے۔ وہاں مسٹر سٹوکس سے ملے جو بپتسمہ کے وقت شملہ میں ان کے ساتھ تھے۔ سٹوکس صاحب امریکہ کے ایک مالدار جوان تھے۔ وہ اس لیے ہندوستان آئے تھے کہ جہاں تک ہو سکے یہاں کے لوگوں کی خدمت کریں۔ وہ سینٹ فرانسس آف اسیسی کے بڑے معتقد تھے اور اُس کے نمونہ پر چلتے ہوئے اپنی زندگی کے تمام پُرانے ڈھنگ تیاگ دیے تھے اور سادھوانہ لباس پہن کر یہ کوشش کرتے پھرتے تھے کہ دنیا میں ایک ایسی برادری قائم کریں، جو خدمت۔ سادگی اور تجرد کے اُصولوں پر چلے۔ چنانچہ سُندر سنگھ

کی بابت وہ یوں لکھتے ہیں :۔

"اپنی زندگی کا ڈھنگ بدلنے کے بعد میں ایک ہندوستانی مسیحی سے ملا جو میرے خیال کا تھا۔ وہ میرے ساتھ مل گیا۔ وہ سکھوں میں سے حال ہی میں مسیحی ہوا تھا۔ اور ایک سال سے مسیحی سادھو بن کر ملک میں دورہ کرتا پھر رہا تھا۔ جب مجھے کام کے لیے اپنے دیش جانا پڑا تھا۔ تو وہ پہاڑ پر رہ کر ہمارے کام کو پھیلانے میں سرگرم رہا۔ اور ایسی دیانتداری سے کام کرتا رہا کہ اس کا نتیجہ دیکھ کر سب کو خوشی ہوئی۔ اس کا کام میرے کام سے کہیں بہتر تھا۔ اگرچہ وہ لڑکا ہی تھا تو بھی اس نے اپنے خداوند کی خاطر بھوک، سردی، بیماری اور قید تک برداشت کی۔" اسی وقت پادری ریڈمین بھی سُندر سنگھ سے ملے اور ان کے متعلق یوں کہتے ہیں :۔

"اس کی مسیحی زندگی نے میرے دل پر گہرا اثر کیا ہے۔ اُس کا چال چلن اس کی بول چال سے ظاہر ہے۔ اب وہ لڑکا معلوم نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک بالغ آدمی ہے جو اپنے ایمان اور عقیدہ میں مضبوط ہے۔ اس وقت وہ اُنیس برس کا جوان ہے۔"

اُسی سال گرمی کے موسم میں مسٹر سٹوکس اور سُندر سنگھ پہاڑوں کے درمیان وادیٔ کانگڑہ میں اپنے بشارتی دورہ پر روانہ ہوئے۔ یہ سفر آسان نہ تھا کیونکہ اس علاقہ کے کٹر ہندو ان دونوں کو اپنے گھروں میں نہ آنے دیتے تھے۔ کھانا پینا بھی مشکل سے ملتا تھا۔ کئی بار بن کھائے پئے درختوں کے نیچے سونا پڑتا تھا۔ سفر کے چند ہفتے بعد سُندر سنگھ کو سخت بخار آیا۔ اُس وقت وہ دونوں ایک غیر آباد جگہ میں تھے۔ مسٹر سٹوکس اس کا بیان یوں کرتے ہیں :۔

میں بہت گھبرا گیا کیونکہ ہم پردیس میں تھے اور کوئی سواری ہمارے پاس نہ

تھی۔ سخت سردی تھی۔ سُندر سنگھ کے کان سے منہ لگا کر میں نے پوچھا کہ تمہاری طبیعت کیسی ہے؟ میں جانتا تھا کہ وہ شکایت کرنے والا نہیں لیکن جو جواب اس نے دیا، مجھے...... ہرگز اس کی امید نہ تھی۔ اپنی آنکھیں کھول کر بے ہوشی کی حالت میں مسکرایا اور بڑی دھیمی آواز سے کہا۔" میں خوش ہوں۔ اُس کی خاطر تکلیف اُٹھانے میں کتنا سکون ہے۔"

بڑی مشکل سے مسٹر سٹوکس اُسے کسی انگریز کے بنگلے میں لے گئے۔ اُس نے اس بیمار کو جگہ دے دی اور وہاں رہ کر وہ تندرست ہو گئے۔ یہ انگریز چائے کی کھیتی کرتا تھا مگر روحانی باتوں کی طرف سے بہت لاپرواہ تھا۔ لیکن ہر روز ان دونوں کی سنگت میں رہ کر اُس کے خیالات بھی خدا کی طرف مائل ہو گئے اور اُس نے اپنے تئیں خدا کے حوالے کر دیا اور اُس پر ایمان لا کر اطمینان اور خوشی حاصل کی۔

پھر وہ دونوں رامپور کتانی اور دوسرے گاؤں میں سے ہوتے ہوئے ۱۹۰۶ء میں سپاٹو واپس پہنچے اور وہاں کے کوڑھی خانہ میں کام کرنے لگے۔ کوڑھیوں کے بچوں کے ساتھ جن کو یہ بیماری نہ تھی، رہا کرتے تھے۔ پھر سال کے آخر میں لاہور جا کر پلیگ کے مریضوں میں دن رات کام کرنے لگے۔ اِس جگہ وہ رات کو بیماروں کے پاس زمین ہی پر سویا کرتے تھے۔

سنہ ۱۹۰۸ء میں مسٹر سٹوکس امریکہ چلے گئے اور سُندر سنگھ بمبئی تک ان کے ساتھ گئے۔ انہیں اُمید تھی کہ فلسطین چلا جاؤں گا مگر راستہ بند تھا۔ اس لیے مرہٹہ دیش میں داخل گئے۔ مگر وہاں کی زبان نہ جانتے تھے۔ اِس لیے بہت سی مشکلیں آئیں۔ اور جب ناسک پہنچے تو پاؤں میں چھالے پڑے ہوئے تھے اور بھوکے اور تھکے ماندے بھی تھے۔ وہ مشن احاطہ میں گئے مگر مشنری کو ان پر شک ہوا اور انہیں وہاں سے نکال دیا گیا۔ جب وہ

لوٹ کر جا رہے تھے۔ تو ایک نوکر ان کے پیچھے دوڑایا گیا کہ اُنہیں بُلا لائے۔ جب سُندر سنگھ واپس آئے تو مشنری نے انہیں ایک پارسل دیا جو ڈاک میں ان کے نام آیا ہُوا تھا۔ پارسل لے کر اسی طرح تھکے ماندے اور بھوکے پیاسے چلے گئے۔ کچھ دُور جا کر ایک نہر کے کنارے دم لینے کو بیٹھ گئے۔ جس وقت دعا کر رہے تھے تو انہیں پارسل کا خیال آیا۔ سو اُسے کھولا۔ دیکھا تو اس کے اندر کچھ کھانے کی چیزیں اور روپے تھے جو کسی دوست نے ان کے لیے بھیجے تھے۔ ان کی ضرورت کا سامان خدا نے مانگنے سے پہلے ہی دے دیا تھا۔

۶

تبّت میں۔ مدرسۂ الٰہی میں اور تقلیدِ مسیح کی برادری

سُندر سنگھ وسطی راجپوتانہ، مدھیہ پردیش اور اُتر پردیش کا لمبا سفر کرنے کے بعد پنجاب واپس آ گئے۔ مگر گرمی کے شروع میں کوٹ گڑھ چلے گئے اور تھوڑے دن وہاں رہ کر ہمالیہ کا رُخ کیا۔ رامپور، گلو اور چینی وغیرہ شہروں میں ٹھہر کر منادی کی اور پھر پُو شہر گئے جو تبت کی سرحد پر ہے۔ اس وقت یہ شہر موریویَن مشن کے بہادر مشنریوں کا ایک بڑا مرکز تھا۔ اُن کے ساتھ ایک ہفتہ تک رہے اور پھر تبت میں داخل ہونا چاہا۔ اس پر وہاں کے مشنریوں نے اپنا ایک منّاد ان کے ہمراہ کر دیا تاکہ سرحد تک ان کی مدد کرے۔ یہ دونوں سرحد کے لوگوں کے درمیان دو مہینے تک رہے۔ پھر منّاد تو واپس ہو گیا اور وہ یہ ٹھان کر کہ جو پیش آئے گا۔ سہوں گا۔ اکیلے ہی تبت کے سخت برفانی اور اُونچے علاقہ میں آگے بڑھتے چلے گئے۔

سُندر سنگھ اُنیس سالہ جوان، بدن پر روئی کا پتلا چوغہ، کندھے پر صرف کمبل اور بغل میں انجیل لے کر اولوں کی بارش میں برفانی دروں سے بے دھڑک گذرتا چلا گیا۔ وہ سرد دریاؤں کو تیر کر پار کرتا اور ڈاکوؤں کے ہاتھوں میں پڑ کر سختیاں جھیلتا اور بدھ مت کے پجاریوں اور زبردست لاماؤں کے تعصب

کا سامنا کرتا رہا۔ یہ تھا تبت میں سُندر سنگھ کے کام کا آغاز۔ وہ خُدا کی محبت اور معافی کا پیغام لے کر خطرناک راستوں اور بھیانک وادیوں سے گذر کر اس الگ تھلگ ملک کے مسیح سے ناواقف لوگوں کے پاس سال بسال پہنچتے رہے۔

اب کچھ عرصہ سے سادھو سُندر سنگھ کو یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ "گو خُدا نے بہت سی باتوں کا بھید مجھ پر کھول دیا ہے، تو بھی مجھے اور زیادہ لیاقت کی ضرورت ہے، تاکہ پڑھے لکھے غیر مسیحیوں کی مشکلات کو حل کر سکوں۔" لاہور کے بشپ لیفرائے صاحب کو سُندر سنگھ سے خاص پیار تھا۔ ان کے کہنے پر لاہور کے سینٹ جانسن ڈِوِنٹی سکول میں داخل ہو گئے۔ ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۰ء تک باقاعدہ تعلیم حاصل کر کے امتحان اور مُنادی کرنے کا لائسنس لے لیا اور ڈیکن کے عہدہ کے لیے سفارش بھی حاصل کر لی۔

اِس کے بہت عرصہ بعد وہ بیان کرتے ہیں کہ "مجھے اِس مدرسہ علم الٰہی سے کچھ فائدہ حاصل نہ ہُوا۔ مجھے سکول پسند نہیں تھا۔ صرف بشپ لیفرائے کا لحاظ تھا اس لیے ان کی خوشی پُوری کرنے کو ٹھہرا رہا تھا۔"

۱۹۱۰ء کی گرمیوں میں وہ پھر تبت گئے۔ وہاں سے لَوٹ کر کئی مہینے کوٹ گڑھ میں سی۔ ایم۔ ایس کے ساتھ کام کیا۔ مگر دیہاتی کام کی پابندیوں کو دیکھ کر ان کا دِل کُڑھتا تھا، اِس لیے اُن رکاوٹوں کی طرف بشپ صاحب کی توجہ دلانے کے لیے ایک دن لاہور جا کر اپنا منادی کا لائسنس ان کے آگے دھر دیا۔ بشپ صاحب بڑے دریا دِل تھے۔ اُنہوں نے بھانپ لیا کہ انہیں آزادی کی ضرورت ہے اس لیے لائسنس کی واپسی کی منظوری دے دی۔ اب سُندر سنگھ کے پاس منادی کرنے کا لائسنس کسی انسان کی طرف سے یا کسی خاص کلیسیا کی خدمت کے لیے نہ تھا۔ بلکہ انہیں خدا نے بلاہٹ دی اور

اُسی کی طرف سے اُن کا تقرر تھا کہ اُس مقام پر کھڑے ہو کر جہاں مسیح اپنے لوگوں کو آزادی دیتا ہے وہ بھی اپنے تجربوں کے پیغام سے پیاسی رُوحوں کو سیراب کر کے اپنے ساتھ ملائیں۔

جن دنوں سُندر سنگھ لاہور کے مدرسۂ علم الٰہی میں پڑھتے تھے، مسٹر سٹوکس بھی امریکہ سے واپس آ گئے۔ آتے ہوئے انگلستان میں کنٹربری کے آرچ بشپ صاحب سے اِن کی بات چیت ہوئی۔ انہوں نے ہندوستان میں برادری کے رواج دینے کی تجویز کو توجہ اور ہمدردی سے سُنا۔ چنانچہ مسٹر سٹوکس کے ہند میں آتے ہی لاہور کے بڑے گرجا گھر میں اس کی ابتدا کی گئی اور اس کا نام "تقلیدِ مسیح کی برادری" رکھا گیا۔ اُس وقت چاروں طرف لوگوں نے اس تحریک سے بڑی دلچسپی ظاہر کی۔ پانچ آدمیوں سے اس کا تعلق تھا۔ چار یورپین اور ایک پنجابی سُندر سنگھ۔ صرف ویسٹرن صاحب نے جو اُن دنوں نناوکی کے بشپ تھے اور مسٹر سٹوکس نے اِس برادری کے اُصولوں کا عہد کر کے رسمی اِقرار کیا تھا۔

سُندر سنگھ نے کچھ مہینے اُن کے ساتھ کام کیا اور پھر اپنے بشارتی کام کے لیے روانہ ہو گئے۔ یہ برادری کچھ سالوں تک تو چلتی رہی مگر مسٹر سٹوکس عقیدے میں پکے نہ تھے اِس لیے الگ ہو گئے۔ جس بات کی طرف اُن کا اُس وقت زیادہ دھیان تھا وہ فرض کی ادائیگی تھی۔ چنانچہ چند مدرسے کھول کر تعلیم دینا شروع کر دیا۔ پھر ہندوستانی زندگی کی آزمائشوں کا پورا پورا مطالعہ کرنے کے لیے اُنہیں ایک ہندوستانی جیون ساتھی کی ضرورت ہوئی، اِس لیے ایک ہندوستانی عورت سے شادی کر لی۔ ہوتے ہوتے اپنے امریکی حقوق چھوڑ دیے اور سرکارِ برطانیہ کی رعایا بن گئے اور پہلی جنگِ عظیم میں ایک

افسر بن کر فوجی بھرتی کا کام کرنے لگے۔ اور جب عدم تعاون کی تحریک شروع ہوئی تو پکے سوارجی بن کر بغاوتی تقریریں کرنے لگے۔ آخر قید ہوئے۔ اب ان کے مذہبی خیال بدل گئے اور مسیحی عبادت بھی بند کر دی اور ہندو مندروں میں جا کر گیان دھیان کرنے لگے۔ آخر ۱۹۳۲ء میں مسیح سے عقیدت بھی جاتی رہی اور شُدھ ہو کر ہندو بن گئے اور سدا آنند نام رکھ لیا۔ ایک دفعہ سُندر سنگھ نے بات چیت کرتے ہوئے ان سے کہا کہ آج آپ سے ملاقات کر کے مجھ پر بھید کھُل گیا کہ تناسخ (آواگون) بھی کوئی چیز ہے۔ پہلے آپ مال دار تھے پھر عہد کر کے غریبی اختیار کی۔ مجرّد رہنے کا عہد کیا مگر شادی کر لی۔ افسر بن کر ایک سال تک سرکار سے تنخواہ لیتے رہے اور دوسرے سال سرکار سے عدم تعاون کر کے جیل گئے۔ ایک وقت تھا کہ آپ جوشیلے مسیحی تھے اور اب ہندو ہیں۔ ہر چھ مہینے بعد آپ ایک نیا جنم لیتے ہیں اور یوں مسئلہ تناسخ کو ثابت کرتے ہیں۔

۷

سادھوجی تبّت میں

سادھو سُندر سنگھ ۱۹۱۱ء میں پنجاب سے ہوتے ہوئے وادیٔ کُلّو میں آئے۔ اس کے بعد گڑھوال میں اور وہاں سے پھر تبت چلے گئے۔

جب بھی اس نے تبت کا ذکر کیا ہے تو ان کی مُراد ہمیشہ تبت خاص سے نہیں ہوتی بلکہ اکثر اُن سرحدی علاقوں سے جو بھوٹ میں شامل ہیں۔ اس علاقے کو چھوٹا تبت کہتے ہیں اور اس میں خاص تبتی نسل کے فرقے آباد ہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ وہ کئی مرتبہ تبت خاص میں بھی کسی نہ کسی طرح داخل ہو کر دُور تک گئے۔ وہ کہتے ہیں کہ "میں نے دریائے سندھ کے شروع کے معاونوں کے کنارے کنارے چڑھ کر برہم پُتر کے دہانے سے تشیا مہونک ایک سڑک پر اڑھائی سو میل لمبا سفر کیا۔ پھر دابہ، ٹوٹلنگ، چیرانگ، ڈونگوا اور گیانیمہ شہروں میں گیا۔ اس کے بعد جھیل مانسرودر کے شمال میں بارکھا اور کیلاش تک پہنچا اور وہاں سے دس پڑاؤ کا سفر طے کر کے ایک چھوٹے سے گاؤں رسار میں آیا جہاں نیپالی نسل کے چند ایک مسیحی خاندان رہتے تھے۔"

ایک دو دفعہ وہ پُوہ سے آگے نکل گئے۔ بعض دفعہ گڑھوال سے ہوتے ہوئے گنگا کی وادی میں اُوپر کی طرف درّہ نیتی سے گزرے جو ۱۶۷۵۰ فٹ اُونچا ہے، مگر سادھوجی کے خیال میں کچھ زیادہ اونچا نہیں۔ بعض دفعہ الموڑا سے پتھوراگڑھ، اسکوٹ، دھارچولا ہوتے ہوئے اگر بیانگ کے

دَرّہ سے گزر کر تحلہ کوٹ تک گئے ..... اِس درّہ کو وہ نہایت دشوار گزار سمجھتے تھے۔ ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۸ء تک کے دَوروں کا ہمارے پاس کوئی سلسلہ وار بیان موجود نہیں۔ صرف چند ایک واقعات ذکر کرنے کے قابل ہیں جو کسی نہ کسی سفر میں انہیں پیش آئے۔

اِن دَوروں میں انہوں نے بہت سی مصیبتیں اُٹھائیں۔ پہاڑی ہندوؤں کو جب معلوم ہو جاتا کہ یہ ہمارے مذہب کے سادھو نہیں بلکہ مسیحی ہیں۔ تو روٹی کا ٹکڑا تو درکنار، رہنے تک کو جگہ نہ دیتے تھے۔ اکثر انہیں درختوں کے نیچے اور پہاڑی غاروں میں سونا پڑتا تھا۔ انہوں نے کبھی بھیک نہ مانگی۔ وہ ہمیشہ خدا پر بھروسہ رکھتے تھے کہ وہی مجھے کھانا دیگا۔ کبھی کبھی تو وہ بھوکے ہی سو جاتے تھے یا صرف جنگلی پھلوں سے اپنا پیٹ بھر لیتے تھے۔ پھر بھی وہ فخر سے کہتے ہیں کہ خدا ہی میری ضرورتوں کو ہمیشہ پُورا کرتا رہتا ہے۔

ان کے راستوں میں نہ صرف تھکا دینے والی چڑھائیاں آتی تھیں بلکہ پُرخطر برفانی نالوں جن میں چٹانوں کے بڑے بڑے ٹکڑے لڑھکتے چلے آتے تھے۔ نیز اُونچے اُونچے کراڑوں کے راستے بھی تھے جن پر پتھر لڑھک آنے کا کھٹکا ہر دم لگا رہتا تھا۔ مثلاً نیتی کی سڑک پر ایک چار ہزار فٹ اُونچی چٹان دیوار کی مانند بلند ہے جس کی جڑ میں پہاڑ کاٹ کر چٹان کے ساتھ ساتھ راستہ بنایا گیا ہے۔ ایک دفعہ سادھو جی نے بتایا کہ "یہ میرا آنکھوں دیکھا واقعہ ہے کہ بدری ناتھ کی سڑک پر سات یاتری چلے جا رہے تھے۔ اُوپر سے چٹان کا ٹکڑا پھسلا اور ان ساتوں پر گر کر سب کو اپنے ساتھ لیتا ہوا دریا میں جا پڑا۔" اکثر طغیانی سے پُل ٹوٹ کر بہہ جاتے ہیں اور ہفتوں آمد و رفت بند رہتی ہے۔ دَرّوں میں بھی ہمیشہ خطرہ رہتا ہے۔ دوپہر کو تقریباً ہر روز برفیلے حصّوں پر برفانی طوفان آتے

ہیں۔ بھوٹ کے باشندوں کا کہنا ہے کہ "سردی کی یہ حالت ہے کہ بھیڑ کی کھال پہن کر بھی ہمیں ٹھنڈ لگتی ہے۔" ایک قافلہ والے نے جو بڑی ہوتی کے درے سے اپنا مال اسباب، بھیڑ بکریوں اور یاک پر لادے آتا تھا اس کتاب کے مصنف سے کہا۔ "پچھلے سفر میں میرے چھ آدمی سردی سے اکڑ کر مر گئے"۔ لیکن سُندر سنگھ ہر سال ننگے پاؤں، صرف سُوتی چوغہ پہنے اور ایک معمولی کمبل کندھے پر ڈالے ان اُونچے اُونچے برفانی دَرّوں سے نکل جایا کرتے تھے۔

تبت قدرتی طور پر کوئی دِل پسند اور مسافر پرور ملک نہیں ہے۔ اس ملک میں ننگی ننگی پہاڑیوں کے وسیع سلسلے دُور تک چلے گئے ہیں۔ جن میں آبادی کا نام و نشان نہیں۔ جہاں گاؤں اور قصبے ہیں۔ ان کے رہنے والے بڑے کٹر پنتھی ہیں ان کے لاما ہمیشہ خبردار اور چوکنے رہتے ہیں کہ کوئی غیر مذہب اُن کے ملک میں داخل نہ ہو جائے۔ اکثر جگہ ڈاکوؤں کی وجہ سے راستے محفوظ نہیں ہیں۔ کھانا ملنا بڑا مشکل ہے۔ مسافروں کو ایک قسم کی موٹی جھوٹی خوراک پر گزر کرنی پڑتی ہے۔ یہ جَو سے تیار کی جاتی ہے اور جسے ہم لوگ ستّو کہتے ہیں۔

کبھی کبھی یہ لوگ سُندر سنگھ سے دوستانہ برتاؤ بھی کرتے تھے۔ لیکن زیادہ تر ان کا برتاؤ ظالمانہ ہوتا تھا۔ ۱۹۰۸ء میں جب وہ پُو سے پہلی دفعہ ان لوگوں میں آئے تو انہوں نے دیکھا کہ ان کی تعلیم سے یہ لوگ ناراض ہو جاتے ہیں۔ جہاں کہیں وہ گئے، لوگوں اور خاص کر لاماؤں نے اُن کی سخت مخالفت کی اور نفرت کا اظہار کیا۔ وہ ایسے زہر سے بھرے تھے کہ جب سادھو جی تعلیم دیتے تو وہ سننے والوں کے پاس کھڑے ہو کر دھمکاتے رہتے تھے۔ بہر حال وہ تشیگنگ کے مشہور شہر میں خیریت سے جا پہنچے۔ یہاں انہیں یہ دیکھ کر بڑی حیرانی اور خوشی ہوئی کہ اس شہر کا گورنر لاما انکے

ساتھ بڑی مہربانی سے پیش آیا۔ یہ ایک نامی شخص تھا اور اس کے ماتحت کئی سَو چھوٹے لاما کام کرتے تھے۔

گورولاما نہ صرف مہربانی سے پیش آیا بلکہ سادھُوجی کو کھانا اور رہنے کا ٹھکانہ بھی دیا۔ ایسے کڑکڑاتے جاڑے میں یہ مسافر پروری بڑی غنیمت معلوم ہوئی۔ اس کے علاوہ گورولاما نے اپنے ماتحتوں کو بُلا کر جمع کیا اور انہیں سادھُوجی کا پیغام بھی سُنوایا۔

وہاں سے روانہ ہو کر وہ دوسرے قصبوں اور دیہاتوں میں گئے لیکن ان جگہوں پر پہلے سے بھی زیادہ مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ بار بار انہیں یہ دھمکی دی جاتی تھی کہ "یا تو مُلک سے باہر نکل جاؤ ورنہ تمہاری شامت آجائے گی۔"

پتھروں سے اُن کے پاؤں گھائل ہو گئے تھے۔ ایک مرتبہ جب وہ ایک جگہ بیٹھ کر زخموں پر پٹی باندھ رہے تھے تو ایک آدمی نے آکر پوچھا۔ "یہ کیا ہُوا ہے؟" سُندر سنگھ نے اپنی عادت کے مطابق اپنے خون آلودہ پاؤں کی بجائے ان پاؤں کا ذِکر چھیڑ دیا جن سے کوہ کلوری پر خون بہہ رہا تھا۔ اِس کہانی میں آدمی کو کچھ دلچسپی نظر آئی اور وہ سچا متلاشی ثابت ہوا۔ اس کا نام تاشی تھا اور وہ اس ضلع کے لاما کا کتابدار تھا۔ سُندر سنگھ اس کے پاس ایک ہفتہ ٹھہرے اور اس عرصہ میں اُس کے ساتھ برابر دعا کرتے اور نصیحت کرتے رہے۔ تاشی ان کے پیغام سے بہت متاثر ہُوا۔ اس نے کہا "جب مَیں نے آپ کے پاؤں سے خون بہتا دیکھا تو میرے دل نے گواہی دی کہ اِس خود اِنکار زندگی کی پشت پر ضرور کوئی طاقتور ہستی موجود ہے۔" اس کے بعد اس نے سادھوجی کو اپنے ایک مہربان دوست

کے پاس بھیج دیا۔ جب سُندر سنگھ وہاں سے واپس آئے تو تاشی کو مسیح کے اطمینان سے معمُور پایا۔ اس کے تمام شک اور وہم مٹ چکے تھے۔ اس نے ابدی زندگی اور اطمینان کو حاصل کر لیا تھا مگر بپتسمہ پانے کی آرزو اُسے بے چین کر رہی تھی اور کسی چیز سے اس کو تسلی نہ ہوتی تھی۔ پس سادھوجی نے اسے اور اس کے خاندان کے نو اشخاص کو بپتسمہ دے کر خدا کی بادشاہی میں شامل کر دیا۔

۸

مسیح کے دو شہید

سادھو سُندر سنگھ نے تبت کے اِس سفر میں کرتار سنگھ کے شہید ہونے کی کہانی بھی سُنی۔ کرتار سنگھ ریاست پٹیالہ کے ایک سِکھ خاندان سے ایک نومرید مسیحی تھا۔ جس وقت اس نے مسیح کے پیرو ہونے کا اقرار کیا، اس کے گھر والوں نے اسے گھر سے نکال دیا۔ کچھ عرصہ مزدوری کر کے وقت گزارتا رہا۔ پھر دل نے گواہی دی کہ تیرا خدا تجھے پہاڑوں میں منادی کرنے کے لیے بلاتا ہے۔ اس لیے وہ تبت میں جا داخل ہوُا اور مسیح کی منادی شروع کر دی۔ آخر اُسے حکم ملا کہ فوراً اِس مُلک سے نکل جاؤ۔ لیکن وہ برابر اپنا کام کرتا رہا۔ اس پر تشنگم کے لاما نے اسے گرفتار کروالیا اور غیر مذہب کی تعلیم پھیلانے کے جُرم میں یہ حکم دیا کہ اس کو سُرا گائے (یاک) کی تازہ کھال میں سی کر خشک ہونے کے لیے دھوپ میں رکھ دیا جائے تاکہ کھال سُکڑ جائے اور وہ اس کے اندر بھینچ کر مر جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ تین دن تک کھال دھوپ میں سُکڑ کر بھینچتی رہی۔ آخر کار وہ شکر بجا لایا کہ خدا نے موت کے وقت اسے اطمینان بخشا۔ کرتار سنگھ مسیح کی خاطر شہید ہو کر سورگ میں جا پہنچا۔

مرنے سے پہلے اسے اپنی انجیل میں چند الفاظ لکھنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ چنانچہ اس نے یہ شعر اُردو میں لکھا:۔

جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی   حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوُا

اور پھر انگریزی کا ایک شعر لکھا جس کا ترجمہ یوں ہے:۔
”کیا یہ بسترِ مرگ ہے جس پر ایک مسیحی لیٹا ہے؟ ہاں مسیحی لیٹا ہے۔ لیکن بستر اس کا نہیں۔ یہ تو موت خود اس پر لیٹی ہے۔“ اور پھر فارسی زبان میں یہ لکھا:۔

جاں خواہم از خدا یکے بلکہ صد ہزار
تا صد ہزار بار بمیرم برائے یار
خسروا درعشقِ او کمتر زہندو زن مباش
کاں برائے مُردہ سوزد زندہ جانِ خویش را

جو لوگ کرتار سنگھ کے مرنے کا نظارہ دیکھ رہے تھے، اُن میں لاما کا نوجوان کتابدار بھی تھا۔ خداوند میں ہو کر جو اطمینان کرتار سنگھ نے پایا، اُس سے کتابدار کے دِل پر گہرا اثر ہوُا۔ چنانچہ اُس نے وہ انجیل لے لی اور اُسے پڑھنا شروع کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوُا کہ اس نے بھی اپنی زندگی کا مالک مسیح کو بنا لیا۔ جب لاما کو یہ خبر پہنچی تو اس نے حکم دیا کہ اس کو بھی کرتار سنگھ کی طرح مار ڈالو۔ اسے بھی سُرا گائے کی گیلی کھال میں سی دیا گیا۔ لیکن یہ زیادہ سخت جان تھا۔ اس لیے مرنے میں دیر لگی۔ تب لوہے کی سیخیں آگ میں لال کر کے اُس کے بدن میں چبھوئی گئیں اور اُسے شہر کی گلیوں میں گھسیٹا گیا۔ آخر میں اس کے ناخنوں کے نیچے کانٹے چبھوئے گئے اور مُردہ سمجھ کر پھینک دیا گیا۔ لیکن آہستہ آہستہ اسے ہوش آ گیا اور وہ بدن گھسیٹتا ہوُا اپنے گھر چلا گیا اور تندرست ہو کر اس نے پھر منادی شروع کر دی جس سے لوگوں کو یقین ہو گیا کہ اسکے خدا نے سچ مچ اسے بچا لیا ہے۔ اس وجہ سے اُسے منادی جاری رکھنے کا موقع مِل گیا۔ اُسی کی زبان سے سندر سنگھ نے کرتار سنگھ کے شہید ہونے کا ذکر سنا تھا۔

گشت لگاتی ہے اور ضرورت کے وقت مسیحی بھائیوں کو مدد دیتی ہے۔ چنانچہ
اس نے کئی ایک واقعات بیان بھی کیے کہ کس طرح اس کی رُوح دنیا کے دُور
دراز مُلکوں میں سَیر کرتی پھرتی تھی۔ اور یہ بھی بتایا کہ اِن روحوں پر کیا بیتی جو مسیح
پر ایمان رکھتی تھیں اور اُن پر کیا گزری جو نافرمانی اور لاعلمی میں دنیا سے رُخصت
ہوئیں۔

سادھو جی نے اس بزرگ سے تین دفعہ ملاقات کی۔ اور اس کے حالات
بیان کرنے سے ہندوستانیوں میں چاروں طرف ولولہ پیدا ہو گیا۔ کہانی کا بہت
کچھ حصّہ ممکن معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن الموڑا کے پادری یُونس سنگھ صاحب فرماتے
ہیں کہ جب میں کیلاش سے چالیس میل کے فاصلے پر گیانہ میں تھا تو بیوپاریوں سے
ایک نہایت عمر رسیدہ رِشی کی کہانی سُنی جو پہاڑ میں گوشہ نشین تھا۔ اِسکے
علاوہ ہندوستان میں خفیہ سنیاس مشن کے لوگ بھی اس بزرگ سے واقف
ہیں اور اسے اپنا سرکردہ بزرگ مانتے ہیں اور براہِ راست اس سے رُوحانی
تعلق رکھتے ہیں۔ سندر سنگھ کہتے ہیں کہ مہارشی کی رویا ہر پہلو سے میری رویا کے
ساتھ نہیں ملتی۔ اس کی رویاء کے ایک بڑے حِصّہ کو مَیں غلط سمجھتا ہوں۔ تو بھی
سَو میں سے ایک رویا تو میرے ساتھ مِلتی ہی ہے۔"

ہندوستان کی سیاحت کے دَوران میں جو معلومات سادھو سُندر سنگھ
نے ہم تک پہنچائیں، ان میں سے ایک خفیہ سنیاس مشن ہے۔ راقم کو کسی دوست
نے ۱۹۱۸ء میں ایک چٹھی لکھی جس کی سادھو جی تائید کرتے ہیں۔ اگرچہ ایسی خفیہ
جماعتوں سے ہندو مذہب ناواقف نہیں۔ لیکن یہ مسیحی جماعت جو ہندو مذہب
کے بھیس میں چھُپ کر کام کرتی ہے، اس کی موجودگی کے بارے کئی ایک خیال
پائے جاتے ہیں۔ اس چٹھی کا بیان یوں ہے:۔

کیلاش کا مہارشی اور سنیاس مشن

اسی وقت کا ایک اور واقعہ ہے جس سے ہندوستان میں ہر طرف بڑا
ولولہ پیدا ہو گیا۔ سُندر سنگھ نے ایک عجیب و غریب بوڑھے مسیحی رشی کو کوہ
کیلاش کی ایک غار میں بیٹھا پایا جس کی کہانی سادھو کے ایک دوست نے چھپوائی
تھی۔ اس کہانی کا بیان حیران کن اور کچھ شک والا بھی تھا۔

یہ مہارشی بہت ہی بوڑھا تھا۔ اس کا دعوٰے اس وقت یہ تھا کہ مَیں ۳۱۸
برس کا ہوں۔ لیکن سُندر سنگھ کا خیال تھا کہ وہ قریباً سو برس کا ہو گا۔ جب سادھو جی
برف کی چمک سے عارضی طور پر اندھے ہو گئے اور اس رِشی کی غار میں جا پڑے تو وہ
اس بزرگ کے منہ سے مسیحی دعائیں کر بڑے ہی حیران ہوئے۔ پھر رشی نے یونانی نئے
عہدنامہ کے قدیم نسخے میں سے چند آیات پڑھیں۔ اس کے بعد رشی نے اپنا قِصّہ
یوں بیان کیا کہ "میں مصر کے شہر اسکندریہ میں پیدا ہُوا تھا اور اسلامی شریعت
کے مطابق تعلیم و تربیت پائی۔ جب جوان ہُوا تو تیاگی بن کر گوشۂ تنہائی اختیار
کیا اور دن رات نماز اور روزہ میں گزارنے لگا۔ پھر ہندوستان کا ایک مسیحی
مرشد ادھر سے گزرا اور اس نے مجھے مسیحی تعلیم دی۔ مَیں مسیح کا پَیرو ہو گیا
اور مدت تک مسیحی مناد بن کر اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ جب بڑھاپے نے اِس
جسمت کے ناقابل بنا دیا تو تبت کے پہاڑوں میں آ کر بیٹھ گیا اور دعا و عبادت
میں زندگی بسر کرنے لگا۔ میری رُوح اِس خاکی جسم کو چھوڑ کر دُنیا کی حدوں تک

۱۹۱۲ء کے آخر میں سادھو سُندر سنگھ پہلے بنارس میں تھے اور پھر سارناتھ (بدھ کی پہلی تعلیم کا مرکز) کو چلے گئے وہ وہاں کچھ ایسے لوگوں سے ملے جو سنیاسیوں جیسا لباس پہنے ہوئے تھے۔ اِن سے بات چیت کرنے پر معلوم ہُوا کہ وہ مسیحی ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ ہم خفیہ طور پر تعلیم دیتے اور منادی کرتے ہیں اور ہم ایک خفیہ جماعت کے ممبر ہیں جس کے دو درجے ہیں۔ پہلے درجے کے لوگ شِشش کہلاتے ہیں۔ اور دوسرے درجے کے سوامی (شِشش کا مطلب چیلہ یا ساتھی ہے اور سوامی کا مطلب گورو یا پیغامبر) شِشش عام ممبر ہوتے ہیں اور عام لوگوں کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔ ایک جگہ جمع ہو کر عبادت کرتے ہیں۔ خاص کر اتوار کو بائبل کی تلاوت کرتے ہیں، بھجن گاتے ہیں اور وعظ سنتے ہیں۔ سوامیوں کی تعداد سات سو بتائی جاتی ہے اور یہ لوگ عام سنیاسیوں کی طرح لباس پہنے اِدھر اُدھر گھومتے ہیں۔ یہ شِششوں کے درمیان خادمانِ دین کے طور پر کام کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ بچوں اور بالغوں دونوں کو بپتسمہ دیتے ہیں اور پاک عشاء کی رسم بھی ادا کرتے ہیں۔

سادھو جی نے سارناتھ میں کچھ دن ٹھہر کر یہ سب کچھ معلوم کیا۔ اور جب وہ واپس بنارس آئے تو یہ لوگ انہیں ایک پُرانے مندر میں لے گئے اور سنسکرت زبان کا ایک گرنتھ دکھایا جس میں پنڈت وشوامتر کے حالات درج تھے جو تین مجوسیوں میں سے ایک تھا۔ مسیح معصوم کی پہلی زیارت کے بعد یہ پنڈت ہندوستان واپس آ گیا تھا۔ اسکے بہت سال بعد وہ فلسطین میں دوبارہ اس وقت پہنچا۔ جب مسیح وہاں تعلیم دے رہا تھا۔ یہ لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ وہی شخص تھا جس کی شکایت شاگردوں نے مسیح سے کی تھی کہ ہم نے اسے معجزے کرتے دیکھا ہے اور اِس واسطے اُسے منع کرتے ہیں کہ وہ ہمارے ساتھ شریک نہیں ہے۔ یہ سنیاسی کہتے ہیں کہ شاگردوں نے اس لیے اعتراض

کیا تھا کہ وہ ایک غیر قوم سے تھا۔ یہ پُرانا گرنتھ جس کا کچھ حصّہ سادھو نے پڑھا۔ قدیم اور جدید سنسکرت میں لکھا ہُوا تھا۔ قدیم حصّے میں وشوامتر کا حال ہے اور جدید سنسکرت میں اِس فرقے کی بعد کی تاریخ لکھی ہے جس کی بنیاد اسی نے رکھی تھی۔ اِس فرقے نے کوئی خاص ترقی نہیں کی۔ لیکن پھر بھی پادری کیری کے زمانہ تک قائم رہا۔ جب اِس فرقے کا حال بعض ممبروں نے سُنا تو ان کا شوق پھر بیدار ہُوا اور وہ پوشیدہ طور پر انجیل کی خوشخبری پھیلانے لگے۔

اِس کے بعد سادھو جی نے ان لوگوں سے کئی جگہوں پر ملاقات کی۔ مثلاً بمبئی، بڑودہ اور جبل پور وغیرہ میں وہ اکثر ان کی دعا بندگی میں شامل ہوتے تھے۔ چنانچہ کئی جگہ پر غلطی سے انہوں نے سادھو جی کو اپنا ہی ایک سوامی سمجھ لیا۔ مگر یہ صرف شِششوں ہی کی غلطی ہُوا کرتی تھی۔ کیونکہ سوامیوں کے آپس میں خفیہ اشارے مقرر ہیں جن سے وہ ایک دوسرے کو پہچان لیتے ہیں۔ سادھو جی نے اِن سے دریافت کیا کہ "آپ اس طرح پوشیدہ طور پر کیوں کام کرتے ہیں؟" انہوں نے جواب دیا "ہم آدمیوں کے مچھوے ہیں، شور نہیں کرتے۔ لیکن ہمیں پوری امید ہے کہ وہ چند سال کے بعد اپنے آپ کو ظاہر کریں گے۔ مگر کوئی وقت مقرر نہیں کیا۔" صرف یہ کہتے ہیں کہ وقت آیا ہی چاہتا ہے۔

ان کا کوئی خاص عقیدہ معلوم نہیں ہوتا اور ان کی تنظیم سادہ اور آسان ہے۔ ان کے درمیان بہت سے مالدار ممبر ہیں۔ جب یہ سوامی ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے ہیں تو یہ بڑے کھلے دل سے ان کی مدد کے لیے پیسہ دیتے ہیں۔ نئے ممبر ایک دم شِشش جماعت میں شامل نہیں کر لیے جاتے بلکہ انہیں ایک خاص عرصہ تک ابتدائی تعلیم دی جاتی۔ اور جب ایک شخص بارہ برس تک خدمت کر چکتا ہے تب اُسے سوامی کا درجہ ملتا ہے۔ شِششوں کی جماعت میں اُونچی ذات کے لوگ ہوتے

ہیں۔ جو پڑھے لکھے اور دولت مند ہوتے ہیں۔ اِن کی تعداد بہت ہے اور یہ لوگ تمام ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں۔

اس کے بعد سُندر سنگھ اکثر ان لوگوں کی عبادت میں شریک ہوتے رہے۔ اپنی کتاب "بغیر مسیح اور اس کے ساتھ" میں ایک آدمی نرائن داس کا جو انہیں متھرا میں ملا تھا۔ یوں ذکر کرتے ہیں:۔

"ایک روز مَیں متھرا میں صبح کے وقت گنگا کے کنارے گیا تاکہ وہاں یاتریوں کو نجات کی خوشخبری دوں۔ میں وہاں پہنچا ہی تھا کہ ایک پنڈت مجھے دیکھ کر میرے پاس آ بیٹھا اور یوں کہنے لگا کہ 'آپ بھی یہاں اشنان کرنے آئے ہیں؟' میں نے کہا 'نہیں۔ مَیں تو ایمان سے مسیح کے خون میں اشنان کر چکا ہوں اور اس کے فضل سے مجھے نجات حاصل ہوئی ہے۔ اب مجھے یہاں یا کسی اور تیرتھ پر اشنان کرنے کی ضرورت نہیں۔ میرا مقصد اِس وقت یہاں آنے سے یہ ہے کہ اِن یاتریوں کو بھی اپنے مُکتی داتا کی بابت بتاؤں۔' پنڈت یہ سُن کر بہت حیران ہُوا اور میری حیرت بھی اس سے کچھ کم نہ تھی۔ جب اس نے خوشی سے کہا 'واہ سوامی جی کیا خوب! میرا مقصد بھی یہاں آنے سے یہی ہے۔' اور وہ بڑی محبت سے بغل گیر ہو کر ملا۔ یہ دیکھ کر کئی ایک یاتری ہمارے پاس آ گئے کہ ایک سادھو اور پنڈت کی گفتگو سُنیں۔ اور ہم دونوں نے مِل کر ان کو نجات کی خوش خبری سُنائی جسے وہ دھیان سے سُنتے رہے۔ جب ہم منادی کر چکے، تو پنڈت جی مجھے اپنے ساتھ اپنے گھر لے گئے اور اپنی بیوی اور دو بیٹیوں سے بھی ملاقات کروائی جو ایسے ہی سرگرم مسیحی تھے جیسے خود پنڈت جی۔ اب کھانا کھانے کے بعد کئی گھنٹے ہماری گفتگو ہوتی رہی۔ انہوں نے بتایا کہ کتنے برس سے وہ اِسی طرح خداوند کی خدمت کر رہے ہیں اور بہت سے لوگ انکے ذریعے

خداوند پر ایمان لائے ہیں۔ گو وہاں کے مشنریوں اور دیگر مسیحیوں کو اس بات کی مطلق خبر نہیں۔ (مرقس ۴: ۲۶-۲۹)

پھر مَیں نے ان سے ان کے مسیحی ہونے کا حال دریافت کیا۔ انہوں نے ایک عجیب واقعہ سُنایا اور کہا کہ مسیح کی بابت تو بہت دفعہ سُنا تھا لیکن چند غلط فہمیوں کی وجہ سے مشنریوں اور مسیحیوں سے دُور ہی رہتا تھا۔ ایک دفعہ الٰہ آباد میں کمبھ کے میلہ کے وقت خُفیہ مسیحیوں کے دو عالموں سے ملاقات ہو گئی۔ وہ سنسکرت کے عالم تھے۔ پہلے مَیں نے یہی سمجھا کہ وہ ہندو ہیں۔ لیکن دھیرے دھیرے اُنہوں نے ایسی صفائی اور خوبی سے ثابت کیا کہ صرف مسیح ہی مُکتی داتا ہے۔ چند ہی دنوں میں میری ساری نفرت جو مسیحیت سے تھی اور ساری غلط فہمیاں رفع دفع ہو گئیں۔ تب ان سچے سنیاسیوں نے مجھے چند دوسرے آدمیوں کے ساتھ صبح سویرے باپ بیٹے اور پاک رُوح کے نام پر جمنا میں بپتسمہ دیا۔ اُسی روز سے مَیں تن من دھن سے اپنے مُکتی داتا کی خدمت میں مصروف ہُوں۔ اگر میری ملاقات یہاں اِن بزرگ سادھوؤں سے نہ ہوتی تو شاید مَیں کبھی مسیحی نہ ہوتا۔ اب میں اور میرا خاندان اس لیے مسیح کو نہیں مانتے کہ کسی نے ہماری مشکلات حل کر دیں بلکہ اس لیے کہ ہم نے خود ہر طور سے اپنے تجربے سے معلوم کر لیا ہے کہ یہ فی الحقیقت دنیا کا منجی ہے۔" (یوحنا ۴: ۴۲)۔

۲ جنوری ۱۹۲۹ء کو سُندر سنگھ نے سپاتُو سے مُصنّف کو ایک خط لکھا تھا کہ "میں ہردوار اور رِشی کیش سے پرسوں واپس آیا ہُوں اور خفیہ سنیاسی لیڈروں کے ساتھ نہایت مفید گفتگو ہوئی ہے۔"

خداوند مسیح کے ان پوشیدہ ایمانداروں سے سادھو نے کئی بار مدد لی۔ ایک دفعہ سادھو گڑھوال کے ایک شہر سری نگر میں بڑے پکے اور جوشیلے ہندوؤں

کے سامنے منادی کر رہے تھے۔ بعض لوگوں نے اُن سے کہا کہ "اگر شہر کے
چوک میں چل کر منادی کرو تو جانیں"۔ چنانچہ سادھو جی وہاں جا کر بے خوف وخطر
منادی کرنے لگے۔ اِس پر کچھ لوگ دوڑے گئے اور ایک مشہور پنڈت کو
بلا لائے۔ اُن کا خیال تھا کہ یہ پنڈت دلیلوں میں سادھو جی کو ہرا دے گا۔ لیکن
جب پنڈت پہنچے تو سادھو جی کے پاس جا کر اپنی دو انگلیاں اُن کے منہ میں
ڈال دیں اور کہا کہ "یہ حرکت مَیں نے اِس وجہ سے کی کہ مَیں ظاہر کرنا چاہتا ہوں
کہ ہم دونوں آپس میں بھائی ہیں دشمن نہیں، کیونکہ ہم دونوں یسوعؔ مسیح
کو اپنا مکتی داتا مانتے ہیں"۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ پنڈت نے اپنے آپ کو بھرشٹ
کر لیا تو نفرت سے چلے گئے۔ سادھو جی اور پنڈت دونوں نے ایک دوسرے کی
سنگت میں اطمینان اور خوشی میں وہ دن گذارا۔

۱۰

روزہ

جولائی ۱۹۱۲ء کا ذکر ہے کہ مَیں سُندر سنگھ سے پہلی بار ملا۔ مجھے ہندوستان
آئے چند ہی مہینے ہوئے تھے اور مَیں علاقہ سرمور کے شہر ناہن میں تھا۔ ایک
روز وہاں کے مسیحی ایک لمبے اور پتلے دُبلے سادھو کو میری ملاقات کے لیے
لائے۔ سادھو جی کے ساتھ ہونے سے یہ لوگ بہت ہی خوش تھے۔ اس سے
پہلے میں نے اُن کی بابت کچھ نہ سُنا تھا۔ مگر ان کی خاموش طبیعت اور ایمان کا
مجھ پر گہرا اثر ہؤا۔ چنانچہ میں نے انہیں راہ کے لیے کچھ دینا چاہا۔ لیکن اس مردِ
خدا نے یہ کہہ کر لینے سے انکار کر دیا کہ میری ضرورت کے لیے میرے پاس
کافی ہے۔

اِن دنوں وہ ایک کالا لمبا چوغہ پہنے اور کندھوں پر ہلکی سی چادر اوڑھے
ہوئے تھا۔ ان کے پاس موٹے ورقوں کی ایک چھوٹی سی انجیل تھی جو اِن دنوں
چھپا کرتی تھی۔ اس وقت وہ مشرق کی طرف گڑھوال کو جا رہے تھے جہاں
سے وہ کچھ عرصہ کے لیے تبت کو روانہ ہونے کا ارادہ رکھتے تھے۔

۱۹۱۲ء کے آخر میں تبت سے واپس آ کر انہوں نے بنگال، بمبئی،
شمالی ہند اور راجپوتانہ کا دَورہ کیا۔ مُدّت سے ایک تجویز ان کے ذہن میں
کروٹیں لے رہی تھی۔ چنانچہ اُس وقت انہوں نے اپنے اندر چند ایک ایسی
کمیاں پائیں جو مسیح کی پوری اطاعت قبول کرنے والی زندگی کے لیے مہلک

کا باعث تھیں۔ بعض دفعہ سختی اور تنگی جو اکثر انہیں اٹھانی پڑتی تھی شکایت پر مجبور کر دیتی تھی کہ "وہ خدا جس نے مجھے اپنے کام کے لیے بلایا ہے، مجھے بھوکا مارتا ہے۔ کبھی دفعہ اُن پر یہ آزمائش آتی تھی کہ اس دُکھ کی راہ کو چھوڑ کر اپنے باپ کے گھر میں آرام سے جا رہوں۔ شک بھی اکثر ان کے دل کو دُکھ دیتے تھے۔ وہ اپنی اِس کمزوری کو مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "جب لوگ لگاتار مجھے گھیرے رکھتے تو مَیں اُکتا کر جی میں ناراض ہو جاتا تھا۔ آخر خالص اور اعلیٰ مسیحی زندگی کے درجہ تک پہنچنے کے لیے اُنہوں نے ارادہ کیا کہ بیابان میں جا کر مسیح کی طرح چالیس دِن کا روزہ رکھیں۔

سُندر سنگھ راجپوتانہ سے ریل گاڑی میں بیٹھ کر ہردوار آئے اور وہاں سے رشی کیش دہرہ دُون کے جنگل کجلی بَن میں گئے اور خدا سے لَو لگا کر دعا اور عبادت میں لگ گئے۔ جوں جوں دن گزرتے جاتے تھے، جسمانی طاقت گھٹتی جاتی تھی، مگر دل صاف ہوتا اور نکھرتا جاتا تھا۔ آخر بدن ہار کر رہ گیا اور غشی کی حالت ہو گئی۔ لیکن ہوش گم ہونے سے پہلے انہوں نے مسیح کو دیکھا کہ اپنے جسم پر صلیب کے زخم لیے ان کے سامنے کھڑا ہے۔ جنگل کے لکڑہاروں نے انہیں اس حالت میں پڑے دیکھ لیا اور کمبل میں لپیٹ کر رشی کیش لے گئے اور ریل گاڑی میں ڈال کر دہرہ دون کی طرف روانہ کر دیا۔ خدا کے رنگ دیکھو کہ اسی وقت سٹیشن پر ایک مسیحی گاؤں این فیلڈ کی بیل گاڑی آئی ہوئی تھی۔ وہاں کے واقف کار دوست سُندر سنگھ کو اپنے گاؤں میں لے گئے اور اُن لوگوں کی خدمت سے جلد صحتیاب ہو گئے۔

یہ تو ناممکن ہے کہ سُندر سنگھ نے چالیس دن کا روزہ پورا کیا ہو کیوں کہ ۲۲ر جنوری ۱۹۱۳ء کو وہ اُجین میں تھے۔ وہاں سے ہردوار جانے میں ایک دن

لگا ہوگا۔ اِس طرح روزہ ۲۳ر یا ۲۴ر جنوری سے پہلے شروع نہ ہو سکا ہوگا۔ پھر لوگ انہیں این فیلڈ لے گئے اور وہاں سے انہوں نے بشپ لیفرائے کے نام ۱۳ر فروری کو ایک چٹھی لکھی۔ اگر اس سے پہلے ایک رات سفر کی اور دو ایک دن اچھا ہونے کے مان لیے جائیں تو ان کا روزہ اٹھارہ دن سے زیادہ نہیں ہوا ہوگا۔

۱۶ر مارچ ۱۹۱۳ء کو مَیں ناہَن ہی میں تھا کہ سُندر سنگھ جن کی رنگت زرد پڑ گئی تھی اور کمزور و دُبلے ہو رہے تھے۔ کالا چوغہ پہنے مجھے ملنے آئے۔ میں نے ڈائری میں لکھ لیا کہ "سُندر سنگھ یہاں پھر پہنچا اور اب تبت کی سرحد کو جانیوالا ہے"!

جس دن وہ اُجین سے روانہ ہوئے۔ نمودار سے تاریں بھیجی گئیں کہ "سُندر سنگھ مر گیا" اُن کی موت کے غم کی خبریں اور مضامین شائع ہوئے، اور شملہ کے گرجا گھر میں ان کی یادگاری کی دعا کی گئی جس کا ذکر انہوں نے ناہَن سے شملہ پہنچتے ہی اپنے کانوں سے خود سُنا۔

سادھوجی کے دشمن فوراً پکار اُٹھے کہ "انہوں نے خود ہی اپنی موت کی تاریں بھیج دی تھیں اور روزہ وغیرہ کچھ نہیں رکھا۔ بلکہ جنوری میں سیدھے شملہ پہنچ گئے تھے۔ لیکن میری ڈائری کی تحریریں جس کے ناہَن کے لوگ گواہ ہیں، اُن کی تردید کو کافی ہیں۔

۱۱

نئی رویا کے نتائج

۱۔ تمام شک دُور ہو گئے۔

فاقہ کش اور زخمی مسیح کے پُر نُور دیدار نے سادھو جی میں عجیب اثر پیدا کر دیا۔ اُن کے تمام شک، ساری آزمائشیں اور بے صبریاں جو پہلے انہیں گھیرے رکھتی اور ستاتی تھیں، ہمیشہ کے لیے دُور ہو گئیں۔ اب مسیح کی نزدیکی اور موجودگی کا انہیں پُورا یقین تھا جس کی وجہ سے دل کو کامل سکون حاصل ہو گیا۔ سادھو جی کہتے ہیں "اس فاقہ کشی کے بعد جب کبھی مجھ پر جسمانی تکلیف آئی تو میں نے ہمیشہ اپنے دل میں یہ سمجھا کہ یہ خدا باپ کی مرضی ہے۔ ضرور مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہے جس سے یہ تکلیف مجھ پر آئی ہے۔"

۲۔ ایذا رسانی بڑھ گئی۔

فاقہ کا دوسرا نتیجہ یہ ہؤا کہ سادھو جی کو اپنے عقیدے کی وجہ سے سخت دقتوں میں سے گزرنا پڑا۔ ایسا معلوم تھا کہ خداوند کی نزدیکی جو سُندر سنگھ اب محسوس کرتے تھے، ان لوگوں کے دلوں کی تمام بدی کو اُبھار دیتی تھی جن میں نافرمانی کی رُوح تھی۔ اگلے چند سالوں میں مسیح کے دُکھوں میں شریک ہونا ان کی زندگی کا اصل اُصول بن گیا تھا اور اسی عرصہ میں اُنہیں اکثر خداوند سے مدد

بھی ملتی رہی جسے وہ فرشتوں کی خدمت سمجھتے تھے۔

شملہ پہنچنے کے بعد وہ پھر چھ ماہ کے لیے تبت چلے گئے۔ راستے میں جو واقعہ پیش آیا اس کا حال ایک ہندو بنام جیارام نے ایک انگریز عورت کے کہنے سے "نور افشاں" اخبار میں شائع کرایا تھا جو ذیل میں درج ہے:۔

"کچھ دنوں کا ذکر ہے کہ ایک مسیحی سادھو بنام سُندر سنگھ نار کنڈا کے آس پاس کے دیہات میں انجیل کی منادی کرتا پھرتا تھا۔ اُسے اس علاقہ میں بڑی تکلیف اُٹھانی پڑی۔ ایک دن جب مَیں اور میرا ساتھی بیٹھے باتیں کر رہے تھے، تو ایک کسان بنام نندی آکر کہنے لگا کہ ہمارے گاؤں میں ایک بڑا عجیب واقعہ ہؤا ہے۔ ایک دن ہم اپنے کھیت میں فصل کاٹ رہے تھے ایک سادھو جی ہمارے پاس آکر مذہب کی باتیں بتانے لگا۔ یہ بات ہمیں سخت ناگوار معلوم ہوئی۔ ہم نے اسے بہت گالیاں دیں۔ لیکن ہمارے کوسنے، بُرا بھلا کہنے اور دھمکانے پر بھی وہ تعلیم دیتا رہا۔ اس پر میرے بھائی نے ایک پتھر اُٹھا کر اس کے سر پر مارا۔ لیکن اس نے اس کی کچھ پروا نہ کی۔ اپنی آنکھیں بند کر کے کہا، "اے خدا! ان کو معاف کر!" اس کے بعد میرے بھائی کے سر میں جس نے اسے پتھر مارا تھا، سخت درد شروع ہو گیا۔ یہاں تک کہ اس کو کام چھوڑنا پڑا۔ تب اس سادھو نے میرے بھائی کی درانتی لے کر خود کٹائی شروع کر دی۔ ہم سب کو بڑی حیرت ہوئی کہ یہ کس قسم کا سادھو ہے جو گالی کے بدلے ہمارے حق میں دعا کرتا ہے۔ چنانچہ ہم اسے اپنے گھر لے گئے۔ اس نے ہمیں بہت اچھی اچھی باتیں بتائیں۔ اس کے چلے جانے پر ہم نے ایک نہایت عجیب بات دیکھی کہ کھیت کے جس حصے میں اس نیک مرد نے درانتی چلائی تھی، وہاں سے پہلے کی نسبت ساڑھے چار من زیادہ گیہوں نکلا۔

ایک اور خط محکمہ جنگلات کے ایک افسر بنام ایس۔ داس نے "نور افشاں" اخبار کو بھیجا۔ جس کا مضمون یہ ہے:-

"ایک دن مَیں پہاڑ سے نیچے آرہا تھا کہ ایک سادھو پہاڑ کی چڑھائی پر جاتا ہُوا مجھے ملا۔ اس کے ہاتھ میں کتابیں تھیں اور کندھے پر کمبل۔ دوپہر کی دھوپ میں جلدی جلدی قدم بڑھائے چلا جارہا تھا۔ چہرے سے پسینہ پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ دل میں خیال آیا کہ اس کے ساتھ ساتھ چلوں اور بات چیت کروں۔ پھر مَیں نے سوچا۔ چلو جانے دو۔ جو کچھ بھی وہ کرے گا اور جہاں جائے گا، مجھے معلوم ہو ہی جائے گا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک گاؤں میں پہنچا اور پسینہ پونچھ کر ایک بڑے شہتیر پر بیٹھ گیا اور گانے لگا۔ مَیں جو ایک سرگرم آریہ سماجی ہوں، اس کا گیت سُن کر مجھے طیش آگیا۔ جب وہ تعلیم دینے لگا تو میں آپے سے باہر ہوگیا۔ لیکن اُسی وقت بھیڑ میں سے ایک آدمی نے آگے بڑھ کر ایک ہی گھتے سے اُس بھگت کو لکڑی پر سے مُنہ کے بل نیچے گرا دیا جس سے اس کے ہاتھ پر سخت چوٹ آئی اور گال سے لہو بہنے لگا۔ مگر یہ بہادر آدمی پھر اُٹھا، اپنی پگڑی سے ہاتھ باندھ لیا اور منہ سے ایک لفظ بھی نہ بولا۔ اِدھر تو آنکھوں کے آنسو خون کے ساتھ مل کر گال پر سے بہہ رہے تھے۔ اُدھر اِس نے خدا کی تعریف کا ترانہ چھیڑ دیا۔ گانے کے بعد ہم سب کے لیے خدا سے برکت مانگی۔

وہ آنسو جو اس نیک مرد نے موتیوں کی طرح زمین پر گرائے ایک دن ضرور زمین سے اصلی موتیوں کی طرح نکلیں گے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اس دھرمی آدمی کے آنسو اور خون بے اثر رہیں؟ ہرگز نہیں۔ مَیں خود بھی کبھی آریہ سماج کا سرگرم ممبر تھا۔ لیکن اب اگرچہ بپتسمہ نہیں پایا۔ پھر بھی دلدل سے نکل کر

چشمۂ حیات کے کنارے آپڑا ہوں۔ اے سوامی جی مہاراج! (سُندر سنگھ)، اِس وقت معلوم نہیں کہ آپ کہاں ہیں؟ لیکن کرپارام جس نے آپ کو نیچے گرایا تھا، آپ کی تلاش میں ہے۔ وہ جاننا چاہتا ہے کہ میرا گورُو کہاں ہے۔ اُس نے پادری جونز صاحب سے بپتسمہ لے لیا ہے۔ اگرچہ اس کی بڑی آرزو تھی کہ آپ کے زخمی ہاتھ سے بپتسمہ پاتا مگر یہ نہ ہوسکا۔ کیونکہ سُنا ہے کہ آپ بپتسمہ نہیں دیتے بلکہ انجیل کی بشارت ہی دیتے ہیں۔ لیکن آپ کو معلوم ہو کہ آپ کی بدولت سینکڑوں رُوحیں مسیح کے پاس آتی ہیں جن کی آپ کو خبر بھی نہیں ہوتی۔"

تبت میں سادھو سُندر سنگھ کی زندگی اور رساد کے کنوئیں سے رہائی پانے کی کہانی مسز پارکر صاحبہ کی لکھی ہوئی کتاب میں سے دی جاتی ہے۔ یہ کہانی اِن ہی الفاظ میں سُندر سنگھ نے مجھے بھی سُنائی تھی۔ انہیں پورا یقین تھا کہ خدا نے ان کی فریاد سُن کر اپنے فرشتے کو بھیجا کہ انہیں کنوئیں سے باہر نکال دے۔ اُنہوں نے مُلک تبت میں داخل ہو کر مسیح کی انجیل کی منادی کی تھی۔ وہ اسی جُرم میں گرفتار ہو کر رساد میں صدر لاما کی عدالت میں لائے گئے۔ جب وہ مجرم ثابت ہوئے تو انہیں پھانسی کی جگہ پر لایا گیا۔ سنگین جُرم کی دو ہی سزائیں تھیں۔ ایک تو یہ تھی کہ مجرم کو تُرا گائے کی گیلی کھال میں سی کر دھوپ میں رکھ دیا جاتا تھا اور کھال کے سُوکھ کر سُکڑ جانے سے مجُرم کی موت واقع ہوتی تھی۔ دوسری سزا یہ تھی کہ مجرم کو ایک خشک کنوئیں کی تہہ میں پھینک دیا جاتا اور اُوپر سے اُس کا منہ بند کر دیا جاتا۔ چنانچہ کنوئیں کی سزا سادھو جی کے لیے تجویز کی گئی۔

یہاں پہنچنے پر اُن کے کپڑے اُتروا لیے گئے اور اس بھیانک کوئیں کی

تاریک گہرائیوں میں ایسی بُری طرح پھینکا گیا کہ ان کے دائیں بازو میں سخت چوٹ آئی۔ اس سے پہلے بھی بہت سے مجرموں کو اس میں ڈالا جا چکا تھا، جن کو باہر نکلنا کبھی نصیب نہ ہُوا۔ آج سادھو جی بھی انسانی ہڈیوں اور گلے سڑے گوشت کے ڈھیروں پر جا گرے انہوں نے کہا "کاش کسی اور طرح موت آتی مگر اس جگہ نہ ڈالا جاتا"۔ جہاں کہیں بھی ہاتھ ڈالتے، سڑے ہوئے گوشت پر پڑتا تھا اور بدبُو کے مارے دماغ پھٹا جاتا تھا۔ اُس وقت اُنہوں نے اپنے نجات دہندہ خداوند کے الفاظ میں کہا "اے میرے خُدا! اے میرے خُدا! تُو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا؟"

دِن گذر گیا۔ رات آ پہنچی۔ دماغی اور جسمانی درد اور پریشانی کی وجہ سے نیند بھی نہ آئی۔ بھوک اور پیاس کی شدّت نے ان کے دُکھ میں اور اضافہ کر دیا۔ اب انہیں محسوس ہونے لگا کہ "بس اب چند گھڑیوں کا مہمان ہُوں"۔ تیسری رات جب وہ چلا چلا کر خدا کے آگے دعا اور فریاد کر رہے تھے تو انہوں نے اپنے سر پر کھڑکھڑاہٹ کی آواز سُنی۔ کوئی شخص اس گہرے اندھیرے کوئیں کے دروازے پر لگے ہوئے تالے کو کھول رہا تھا۔ انہوں نے چابی گھمانے اور کوئیں کے فولادی ڈھکنے کے کھلنے کی آواز سُنی۔ تب کوئیں کے منہ سے انہیں یہ آواز سنائی دی۔ "یہ رسّا جو تیری رہائی کے لیے لٹکایا جاتا ہے، اسے پکڑ لے"۔ جونہی رسّا ان تک پہنچا انہوں نے ساری رہی سہی طاقت کے ساتھ اسے تھام لیا اور وہ اِس گھناؤنی اور گندی جگہ سے کھینچ کر باہر کی تازہ ہوا میں لائے گئے۔

جب کوئیں سے باہر نکل گئے تو ڈھکنا پھر بند ہو کر تالہ لگ گیا۔ سادھوجی نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ مگر ان کے رہا کرنے والے کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اب ان

کے بازو کا درد بھی جاتا رہا اور تازہ ہُوا سے جان میں جان آ گئی تھی۔ اس وقت خدا کی حمد کے سوا اور کچھ نہ سُوجھا کہ اس نے کیسے عجیب طریقہ سے رہائی بخشی۔ صبح ہوئی تو پھر رسار پہنچے اور جب تک منادی کرنے کے قابل نہ ہوئے، ایک سرائے میں ٹھہرے رہے۔ کوئیں میں سے نکل آنے پر شہر میں بڑی ہلچل مچ گئی۔ لاما کو بھی ایک دم خبر پہنچائی گئی کہ جس کو مُردہ سمجھے تھے، وہ بھلا چنگا تعلیم دیتا پھرتا ہے۔

سرکاری آدمی سادھوجی کو گرفتار کر کے پھر لاما کی کچہری میں لائے۔ اور جب ان سے پوچھا گیا کہ یہ کیسے ہُوا تو اپنی رہائی کا سارا قصّہ کہہ سُنایا۔ سُنتے ہی لاما کے غصّے کی کوئی انتہا نہ رہی اور چلّا کر بولا "ضرور کسی نے چابی چُرا کر تمہیں کوئیں سے باہر نکالا ہے"۔ لیکن جب چابی کی تلاش کی گئی تو خود لاما کی پیٹی میں سے نکلی۔ اس پر خوف کے مارے لاما کی زبان بند ہو گئی۔ اور سُندر سنگھ کو حکم دیا کہ "اِس جگہ سے چلے جاؤ۔ اور جہاں تک ہو سکے دُور نکل جاؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارا زبردست خدا مجھ پر اور میری قوم پر کوئی ناگہانی آفت نازل کر دے۔"

۱۹۱۶ء میں سادھوجی نے لکھا "مَیں خدا کا شکر کرتا ہُوں کہ اُس نے مجھ جیسے ناچیز انسان کو جوانی میں ہی چُن لیا کہ مَیں اپنی توانائی کے دِن اس کی خدمت میں صرف کروں۔ بپتسمہ سے پہلے بھی میری یہ دعا تھی کہ اے خُدا! مجھے اپنی سیدھی راہ دکھا۔ چنانچہ وہ جو راہِ حق اور زندگی ہے، مجھے نظر آیا اور سادھو بنا کر اپنی خدمت اور پاک نام کی تعلیم دینے کے لیے بُلا لیا۔ اگرچہ اب تک بھُوک، پیاس، گرمی، سردی، قید، حوالات، لعن طعن، کمزوری، توانائی، دُکھ، تکلیف اور سختیاں سہتا رہا ہوں۔ پھر بھی میں اس کے مبارک

نام کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس کے فضل سے میرا دل ہر وقت خوشی سے بھرا رہتا ہے۔ اور میں اپنے دس سالہ تجربہ سے بلا جھجک کہہ سکتا ہوں کہ جو صلیب اٹھاتے ہیں۔ صلیب انہیں اٹھا لیتی ہے۔"

۱۹۱۴ء میں وہ دارجلنگ گئے اور ایک تبتی مسیحی بنام تار چین کے ہمراہ دارجلنگ کی طرف سے تبت میں داخل ہونے کی کوشش کرنے لگے مگر سرکاری افسروں نے گنگٹوک کے مقام پر روک کر واپس لوٹا دیا۔ واپسی پر تار چین کو وہیں چھوڑ کر اکیلے نیپال میں داخل ہوئے۔ اور جب وہ وہاں کے دیہات میں منادی کرنے گئے تو انہیں دھمکایا گیا کہ "واپس چلے جاؤ۔" لیکن وہ بدستور اپنا کام کرتے رہے۔ جب سرحد کے ایک شہر ایلوم میں داخل ہوئے تو وہاں کے لوگوں نے کہا کہ "مسیحی تعلیم کا پرچار بند کرو۔" لیکن سادھو جی نے کہا "جو کچھ میرے مکتی داتا نے میرے لیے کیا مجھے اس کی گواہی دینا ضرور ہے۔" سادھو جی فرماتے ہیں "اتنا سنتے ہی انہوں نے مجھے چھ ماہ کے لیے قید میں ڈال دیا۔ وہاں میں نے قیدیوں کو تعلیم دینا شروع کر دیا۔ اس کی بھی ممانعت کی گئی۔ جیل کے داروغہ نے کہا کہ "یہی تعلیم دینے پر تو تمہیں جیل میں ڈالا گیا تھا اور وہی تعلیم تم یہاں دے رہے ہو!" میں نے جواب میں کہا کہ مجھ سے خاموش نہیں رہا جاتا۔ میں اپنے مکتی داتا کی کہانی سنائے بغیر نہیں رہ سکتا، پھر اس نے قیدیوں کو حکم دیا کہ اس شخص کی بات مت سنو، انہوں نے جواب دیا کہ آپ تو ہمیں بہتر نہ بنا سکے۔ اگر اس شخص کی تعلیم ہمیں بہتر بنا سکتی ہے تو آپ کو خوش ہونا چاہیے، یہ سن کر داروغہ کو خوف ہوا کہ کہیں سارے قیدی مسیحی نہ ہو جائیں۔

آخر مجھے جیل سے نکال کر ایک گؤشالہ میں ڈال دیا۔ کیونکہ اور تو کوئی جگہ ان کے پاس تھی نہیں۔ یہاں مچھروں کا کچھ ٹھکانہ نہ تھا۔ میرے کپڑے اتروا کر

ہاتھ پاؤں شکنجے میں کسوا دیے اور ایک ٹوکرا بھر جونکیں میرے سارے بدن پر چپکا دیں۔ یہاں تک کہ میری آنکھوں کے گرد بھی جونکیں لگا دیں اور میں دیکھنے سے بھی رہ گیا۔ جب وہ خون چوستی تھیں تو سخت درد ہوتا تھا۔ اس وقت میں اپنی کمزوری کا اعتراف کرتا ہوں۔ خدا اپنے تئیں مجھ پر ظاہر کرنا چاہتا تھا اور میں رونے کو تھا۔ میرا خیال تھا کہ کل صبح تک تمام خون خارج ہو جانے سے میں مر جاؤں گا۔ مگر جب میں دعا میں لگ گیا تو میرے بدن میں ایک بجلی کی رو سی دوڑ گئی۔ میرا قید خانہ فردوس بن گیا۔ میں نے دل میں کہا کہ کیا فردوس اس سے بہتر ہو سکتا ہے؟ جونکوں کا خیال بالکل جاتا رہا۔ میں گویا تو نہ تھا لیکن ایک ہندی بھجن گانے لگا۔ اس وقت میرا دل خوشی سے بھر گیا۔ اس عذاب کی حالت میں مجھے میرے مکتی داتا کا بخشا ہوا بے مثال اطمینان دل کو گرما رہا تھا۔

ایک آدمی جیل کے داروغہ کے ساتھ مجھے دیکھنے آیا۔ یہ وہی تھا جس نے میری مخبری کی تھی اور میں نے اسے لوقا کی انجیل پڑھنے کو دی تھی لیکن اس نے لے کر پھاڑ دی تھی۔ مجھے دیکھ کر یہ آدمی بہت حیران ہوا اور داروغہ سے پوچھا کہ "آپ کا اس سادھو کے بارے میں کیا خیال ہے؟" اس نے جواب میں کہا کہ "میرے خیال میں یہ آدمی دیوانہ ہے۔" یہ سن کر وہ آدمی بولا "اگر دیوانہ ہوتے ہوئے اس قدر خوشی ہو سکتی ہے تو میں بھی دیوانہ بننے کا خواہش مند ہوں۔" یہ لوگ سادھو جی کو چھوڑ کر چلے گئے۔ انہوں نے سارا دن اور ساری رات اسی طرح کاٹی۔ صبح کو انہوں نے آ کر جو دیکھا تو سادھو جی کے چہرے پر وہی خوشی اور بشاشت تھی جسے دیکھتے ہی دشمنوں پر وہم اور خوف چھا گیا اور انہیں آزاد کر دیا۔

نیپال کے قید خانہ کی ناقابلِ بیان سزا کے دوران میں خداوند کی موجودگی سے جو اطمینان اور خوشی حاصل ہوئی۔ اس کا بیان سادھو جی نے انجیل کے ورق پر

درج کر لیا تھا۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد یہ الفاظ اُس پر لکھے ہوئے ملے :۔ "نیپال ۲۰ جون ۱۹۱۴ء۔ مسیح کی موجودگی نے میرے قید خانہ کو فردوس بنا دیا۔ اس زندگی کے بعد یہ موجودگی آسمان پر کیا کچھ نہ کرے گی۔"

نیپال سے رہائی پانے کے چند دن بعد تارچند انہیں پھر ملا۔ اُس نے بتایا کہ "سُندر سنگھ کا بدن زخموں اور ناسُوروں سے بھرا پڑا تھا۔ جن کی میں نے مرہم پٹی کی۔ بدن جگہ جگہ سے سُوجا ہُوا تھا۔ خاص کر آنکھوں پر تو بے حد سُوجن تھی۔" اس کے بعد اُن کے بہت سے دوستوں نے جونکوں کے نشان دیکھے جو مرتے دم تک اس کے بدن پر رہے اور ان کے نیپال جانے کی سچی شہادت تھے۔

۳۔ ان کی رویا

تیسرا نتیجہ جو اس کے فاقہ سے ہُوا وہ یہ تھا کہ اِس واقعہ کے بعد وہ عالم بالا کی رویا دیکھنے لگے۔ ایک دفعہ رام پور میں انہوں نے یسُوعؔ مسیح کی صورت میں خدا کا پُر جلال دیدار کیا۔ فاقہ کے بعد انہیں ابنِ آدم اپنے آسمانی جاہ و جلال کے ساتھ نظر آ ہی چکا تھا جس سے ان کے تمام شک رفع ہو چکے تھے اور مسیح کی ہمیشہ کی سنگت کا یقین حاصل ہو گیا تھا۔ اسکے بعد وہ کہتے ہیں "میں نے مدھم سی غیر یقینی آوازیں سُنیں"۔ ایک دفعہ ۱۹۱۴ء یا ۱۹۱۵ء میں کوٹ گڑھ کے سکول کے لڑکوں کے لیے جنگل میں دعا کر رہے تھے کہ یکایک انکی رُوحانی آنکھیں کھُل گئیں اور انہوں نے عالمِ ارواح کی شان و شوکت کو دیکھا۔ وہ دنیا ایسی تھی کہ جس کی کیفیت ان کی سمجھ سے باہر تھی۔ اس وقت وہ یہ سمجھے کہ "میں مر گیا ہوں"۔ بہت دیر کے بعد انہیں یہ احساس ہُوا کہ "میں نے دراصل رویا دیکھی"۔

بعد میں یہ رویائیں دکھائی دیتی رہیں۔ انہوں نے دیکھا کہ آسمان کے دروازے کھُل گئے ہیں اور رُوحیں مسکراتی ہیں۔ لیکن ان کی گفتگو صاف سنائی نہیں دیتی کچھ عرصہ گزرنے پر جب رویا مہینے میں دس بارہ دفعہ دکھائی دینے لگی تو وہاں کے رہنے والوں سے وہ بات چیت کرنے لگا۔ اس کی تعلیمات میں دی ہوئی بہت سی مثالیں اور خدا کے کلام کی کئی ایک تشریحیں ان پر اس وقت ظاہر ہونے لگیں جب وہ بہشت والوں سے رویا میں باتیں کرتے تھے۔

سادھو جی کی بابت مجھے ایک رات کا واقعہ صفائی سے یاد ہے جب کہ انہوں نے پہلی دفعہ اپنی رویا کا بیان مجھ سے کیا۔ گرمی کے موسم میں وہ میرے ساتھ کھرڑ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ہم دونوں اندھیری رات میں ڈیڑھ گھنٹہ تک اِدھر اُدھر گھومتے رہے۔ وہ اپنی عجیب کہانی بڑی روانی سے سُناتے رہے جس وقت وہ اپنے دیکھے ہوئے حالات بیان کرتے اور ان شاندار نظاروں کے تصوّر سے دوبارہ لطف لیتے تو ان کی خوشی مستی کی شکل اختیار کر لیتی تھی۔ وہ اِس مدہوشی میں جوش سے بھر جاتے اور دھیرے دھیرے ان کی آواز بلند ہوتی جاتی، اور پھر رات کی خاموشی میں وہ اچانک گرج پڑتے تھے۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ ان کی رویا کی خوشی اس درجہ کی تھی کہ اس کا تصوّر بھی انہیں متوالا بنا دیتا تھا۔

یہ رویا کسی کمزور دماغ کی خیالی تصویر نہ تھی۔ وہ اپنی مرضی سے رویا نہیں دیکھ سکتے تھے بلکہ کبھی کبھی جب وہ دعا میں مشغول اور دھیان میں ڈوبے ہوتے تو روحانی دنیا کے اسرار دیکھنے کو اندرونی آنکھ اور وہاں کی گفتگو سننے کو اندرونی کان کھُل جاتے تھے۔

ان کی رویا کے لیے کسی وقت کی پابندی نہ تھی۔ مثلاً کبھی کبھی وہ کُرسی پر

بیٹھے بیٹھے رویا دیکھ لیتے تھے۔ اور ایک دفعہ تو ریل میں سفر کرتے ہوئے
بھی انہوں نے رویا دیکھی۔ ایسے موقعوں پر برابر والے کمرے کی آوازوں
کی انہیں یونہی معمولی سی خبر رہتی تھی۔ اور جب رویا تمام ہو جاتی تو
کسی قسم کی تھکاوٹ کا احساس باقی نہ رہتا تھا بلکہ ایک ایسی خوشی رہ
جاتی جو بیان سے باہر ہوتی تھی۔

یہ گفتگو جو وہ فرشتہ سیرت ہستیوں سے کرتے تھے، کسی خاص
زبان میں نہ ہوتی تھی بلکہ ایک پُرنور انکشاف ہوتا تھا، یعنی ان کے لب
ہلنے سے پہلے اس پر روشن ہو جاتا تھا کہ یہ کیا کہنے کو ہیں۔ بعض دفعہ بڑا مشکل
نظر آتا تھا کہ ان بھیدوں کو کس طرح اور کن الفاظ میں بیان کریں۔ وہ اپنی
رویا کے خیال کو بتانے کے لیے اکثر اردو کے الفاظ کی تلاش میں سر دھنتے
اکثر بڑے افسوس سے کہا کرتے کہ صرف آسان رویا کا بیان ہی الفاظ میں
کیا جا سکتا ہے۔"

۱۲

جنوبی ہند اور لنکا میں منادی کیلئے بُلایا جانا

سادھو سندر سنگھ کے ۱۹۱۵ء اور ۱۹۱۷ء کے درمیانی عرصہ کے دورے
کی کوئی اطلاع ہمارے پاس نہیں ہے۔ کئی ایک خطوں کے حوالوں سے ظاہر
ہوتا ہے کہ اس عرصہ میں وہ پوڑی گڑھوال اور کماؤں کے علاقہ ڈنگوکی میں
سے ہو کر گذرے اس وقت وہ تبت کے دروں کی طرف سفر کر رہے تھے۔
پھر تبت اور نیپال سے واپس آتے وقت ۱۹۱۷ء میں پتھورا گڑھ میں
کچھ دن رہے۔

کئی سال سے سادھو جی کے حالات اور ان کے تجربوں کی خبریں مسیحی
اخبارات میں چھپنے لگ گئی تھیں۔ ۱۹۱۶ء میں دو ایک چھوٹی چھوٹی کتابیں
اردو زبان میں شائع ہوئیں جن میں ان کی زندگی کے رونگٹے کھڑے کر دینے
والے حالات درج تھے۔ اس قسم کی خبروں کے سبب ہندو اور مسیحی
دونوں انہیں دیکھنے اور ان کی باتیں سُننے کے یکساں مشتاق ہو گئے۔

۱۹۱۷ء کے آخر میں وہ بھوپال گئے اور وہاں اپنا کام ختم کر کے
سیدھا سپاٹو جانے کا قصد کیا۔ لیکن اسی رات رویا میں انہیں خدا کی طرف
سے دعوت دی گئی۔ وہ کہتے ہیں "میں نے پانچ بجے صبح بھوپال سے سپاٹو
جانے کا انتظام کیا تھا۔ اور جب رات کے نو بجے سونے کے کمرے میں
تھا۔ تو میں نے ایک رویا دیکھی جس میں دیگر ہدایات کے علاوہ یہ بھی تھا کہ

جنوبی ہند کو جاؤ۔ سو مَیں گیارہ بجے اپنے میزبان کے پاس گیا اور کہا کہ میں یہاں سے اتنے سویرے رخصت نہیں ہوں گا اور رات کو پڑ کر سو گیا۔ اگلے دن صبح ۹ بجے مجھے ایک تار ملا کہ جنوبی ہندوستان چلے جاؤ۔ مجھے یاد ہے کہ صرف یہی ایک موقعہ تھا کہ مجھے رویا کے ذریعہ ایسی ہدایت ملی۔"

خدا کا یہ پیغام ایک نئی اور وسیع خدمت کی طرف بُلا رہا تھا۔ جنوبی ہند میں بڑی بڑی مسیحی جماعتیں تھیں جو بہت ادنٰے درجہ کی مسیحی زندگی بسر کر رہی تھیں۔ وہ لوگ اپنی زندگی سے گواہی نہیں دے رہے تھے۔ ان میں سے اکثر اپنے آس پاس کے پڑوسیوں میں انجیل کی خوشخبری پھیلانے کے لیے کچھ بھی نہ کرتے تھے۔

ایک سُریانی کلیسیا تھی جس کے پیرو اپنے آپ کو مسیح کے حواری توما کی روحانی اولاد سمجھتے تھے۔ یہ تواریخی حقیقت ہے کہ یہ کلیسیا دوسری صدی عیسوی میں جنوبی ہند میں موجود تھی۔ اس کے بعد پانچویں صدی عیسوی میں اس کلیسیا نے نسطوری خیالات اختیار کر لیے۔ اور پھر سترھویں صدی میں یہ یعقوبی سُریانی کلیسیا میں شامل ہو گئے۔

اِن جماعتوں میں سادھو جی کا پہنچنا تھا کہ لوگ وعظوں کی درخواستیں لے کر ان کے گرد جمع ہونے لگے۔ لوگ ان کا کلام سننے کے بڑے آرزومند تھے۔ ان دنوں قومی تحریک کا چرچا بہت پھیلا ہُوا تھا۔ لیکن وہ ان کے درمیان اُسی رسمی لباس اور اُسی طریقہ سے آئے جس طرح ہندوستان کے سچے بھگت عام طور پر زندگی گزارتے ہیں۔ اور ان مُردہ جماعتوں میں تازگی لانے اور جان ڈالنے کے لیے اپنا پیغام بھی جو اُن کا ذاتی تجربہ تھا۔ اُن تک پہنچایا۔ اُن کے وعظ کے وقت ہر روز بڑی بھیڑ جمع ہو جاتی تھی۔ سکولوں اور کالجوں میں بھی تقریریں

کرتے تھے۔ وہ مسیحی گروہوں کے ساتھ ملاقاتیں، دعا کے لیے درخواستیں سُنتے، خطوں کے جواب دیتے، غیر مسیحی متلاشیوں کے ساتھ بڑی رات گئے تک گفتگو کرتے جس سے ان کے رات کے آرام میں کافی خلل ہوتا تھا۔ وہ بیل گاڑیوں، کشتیوں اور ریل گاڑیوں میں اِدھر اُدھر سفر کرنے سے تھک کر چُور ہو جاتے تھے۔ یہ دن ان کے لیے بڑی محنت کے دن تھے، مگر ان کلیسیاؤں کے لیے برکت کے دن تھے۔

جنوبی ہند کی کلیسیاؤں کی بیداری کے لیے جو دعوتی پیغام سادھو جی نے شائع کیا تھا وہ یہ ہے:۔ "اے نوجوانو! جاگو اور آنکھیں کھول کر دیکھو کہ کتنی روحیں تمہارے اِردگرد روزانہ ہلاک ہوتی جاتی ہیں۔ کیا انہیں بچانا تمہارا فرض نہیں ہے؟ مسیح کے بہادر سپاہی بنو۔ پوری طرح ہتھیار بند ہو کر آگے بڑھو۔ شیطان کے کاموں کو مٹا ڈالو تو فتح تمہاری ہے۔ خدا کی حمد ہو۔ اُس نے تمہیں بچنے اور دوسروں کو بچانے کا قیمتی موقعہ عطا کیا ہے۔ اگر اب بھی غفلت کرو گے تو پھر کوئی دوسرا موقع ہاتھ نہ آئے گا۔ کیونکہ تم دوبارہ لڑائی کے میدان سے نہیں گزرو گے۔ وہ دِن بہت جلد آنے والا ہے کہ تم شہیدوں کو ان کے جلال میں دیکھو گے یعنی ان کو جنہوں نے دوسری رُوحوں کو مسیح کے پاس لانے میں اپنی صحت، دولت اور جان تک کا دریغ نہ کیا۔ سچ مچ انہوں نے بڑا بھاری کام کیا ہے۔ کاش ہم اُس دن اُن کے رُوبرو شرمندہ نہ ہوں۔"

فروری ۱۹۱۸ء میں انہوں نے یعقوبی سریانی کنونشن میں حصّہ لیا جس میں بیس ہزار لوگ شریک تھے۔ پھر وہاں سے مارتھوما سیرین کنونشن میں گئے جس کے اجلاس ایک خشک دریا کے طاس میں ہر سال ہُوا کرتے ہیں۔ یہ

کونشن ایک ہفتہ تک رہتی ہے اور پچیس ہزار آدمیوں کے بیٹھنے کے لیے ایک شان دار پنڈال بنایا جاتا ہے۔ اس موقع پر مارتھوما کلیسیا کے دو بشپ ایک چھوٹے سے چبوترے پر شان دار لباس پہنے بیٹھے تھے اور ان کے بائیں ہاتھ بھیڑ کے اِردگرد عورتیں سفید کپڑے پہنے ریت پر بیٹھی تھیں۔ سادھو جی ہر روز خدا کا پیغام سناتے اور لوگوں کی گنتی بڑھتی ہی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ پنڈال کو بڑا کرنا پڑا تا کہ اس میں بتیس ہزار لوگ سما سکیں۔ یہ ایک بھاری تقریب تھی۔ سادھو جی نے لوگوں سے درخواست کی کہ ان کی دعوت پر کان دھریں جیسے وہ اتنی مدت سے بھولے ہوئے ہیں، یعنی زندہ مسیح کی بشارت ہندوستان کے ان بے شمار لوگوں کو سنائیں جنہوں نے اب تک نہیں سُنی۔

سادھو جی کے جنوبی ہند میں جانے سے مسیحیوں کے درمیان بڑی رُوحانی بیداری پیدا ہو گئی اور بہت سے غیر مسیحی بھی جاگ اُٹھے۔ ایک مقام پر اُنیس غیر مسیحی مسیح پر ایمان لے آئے۔ اور ایک دوسری جگہ پر تیرہ خاندان مسیحی ہوئے۔ اس وقت جو بھی خط ان کے پاس سے آتا اس میں غیر مسیحیوں کا ذکر ہوتا تھا جو اس کا پیغام سُن کر مسیح کی طرف کھنچ آئے تھے۔

سُندر سنگھ ماہ مئی میں سمندر پار کر کے لنکا پہنچے اور اس جزیرے میں چھ ہفتے رہے۔ وہاں جلسوں میں روحانی طاقت کی عجیب کیفیت تھی۔ سادھو جی نے دیکھا کہ کلیسیا مالدار ہے مگر ذات پات کے بندھنوں میں جکڑی ہوئی ہے۔ جب اُنہوں نے زندہ خداوند کی شراکت کا پیغام اُن تک پہنچایا اور خداوند کو سچ مچ جاننے والوں کے دائمی اطمینان کا ذکر کیا تو بہت سے پُورے طور پر خداوند کے قدموں میں آ گئے۔

اُس وقت شکرگزاری کے جو خط سادھو جی کے نام لکھے گئے، ان کا ایک

پلندہ میرے سامنے موجود ہے۔ ان کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ خدا کی برکتوں کے لیے ان کے کس قدر شکرگزار تھے۔ ان میں سے چند نمونے ذیل میں درج ہیں:-

ایک صاحب لکھتے ہیں:-

"جب سے آپ کالی کٹ سے تشریف لے گئے ہیں۔ میں ان مبارک دنوں ..... کو جو آپ کے ساتھ بسر کیے نہایت شکرگزاری کے ساتھ یاد کرتا ہوں۔ پچھلے ہفتے جب ایک مسلم نوجوان ہمارے پاس آ کر کہنے لگا کہ آپ کی تقریر سُننے کے بعد مَیں نے ارادہ کر لیا کہ مَیں مسیحی ہو جاؤں گا تو ہم کو وہ دن پھر یاد آ گئے۔"

کولمبو سے ایک بہن نے لکھا:-

"کل رات آپ کا مؤثر وعظ سُن کر مجھ پر یہ بات بخوبی روشن ہو گئی کہ یہ پیغام خود یسوعؔ مسیح کی طرف سے تھا اور مجھے یقین ہے کہ میرے گناہ معاف ہو گئے۔ اگر لنکا میں آپ کی آمد نے صرف ایک گنہگار کا رخ جو خُدا سے کوسوں دُور تھا کلوری کی طرف پھیر دیا تو سچ مچ آپ نے آسمان پر فرشتوں کو خوشی منانے کا موقع بخشا ہے۔"

ایک اور خط یہ ہے:-

"ہمارے دِل کی تہہ میں جو کچھ گزر رہا تھا آپ نے اس میں جوش پیدا کر دیا ہے اور ہمارے روحانی نظریہ کو نہایت پختہ کر دیا ہے۔"

کانڈی سے ایک بھائی لکھتا ہے:-

"مجھے یقین ہے کہ ہمارے درمیان بیداری شروع ہو گئی ہے۔ اور آپ کی منادی کی وجہ سے آج بہت سے لوگ یسوعؔ مسیح میں پناہ پا کر خوشی مناتے ہیں۔"

ایک اور صاحب لکھتے ہیں :-

"جب آپ کالی کٹ میں تھے تو ایک سب پوسٹ ماسٹر نے آپ کا وعظ سُنا گویا کہ خدا کی آواز آپ کے ذریعہ سے سُنی۔ اس کے کچھ دن بعد اس نے خواب میں مسیح کو پکارتے سُنا۔ اب وہ ہر روز میرے ساتھ انجیل کو سمجھنے کے لیے وقت نکال کر آتا ہے اور کہتا ہے کہ میں بپتسمہ لے کر پُوری طرح مسیح کی پیروی کرنا چاہتا ہوں۔"

ایک اور خط ہے جس میں سادھو جی سے دعا کے لیے درخواست کی گئی ہے۔

"منی پے کا پوسٹ ماسٹر بیس برس سے شراب کی عادت میں گرفتار تھا۔ اس نے خدا کی طاقت سے بھرپُور ہو کر اپنی بُری عادت چھوڑ دی۔ دو ہفتے ہوئے وہ مرگیا۔ لیکن مسیحی ہو کر مرا۔ جب سے وہ مسیحی ہُوا تھا وہ اپنے آسمانی باپ کے ساتھ رہتا اور چلتا پھرتا تھا۔ کاش کہ خدا مجھے بھی اُسی طرح بچالے۔"

اس زمانے میں جب بھی لوگوں کو موقع ملتا۔ ان کے پاس آکر ان کے قدموں میں بیٹھ جاتے۔ یہاں تک کہ رات کو بھی آرام نصیب نہ ہوتا تھا۔ ایک دفعہ وہ رات کے ایک بجے سونے کو تیار ہوئے۔ ایک گھنٹہ سوئے کہ ایک برہمن نے دو بجے جگا دیا۔ یہ برہمن راہِ حق کی کھوج میں تھا اور دن چڑھنے تک ان سے باتیں کرتا رہا۔

بہت سے لوگ چاہتے تھے کہ وہ انہیں اور انکے بچّوں کو برکت دیں تو وہ جواب دیتے تھے کہ اُن ہاتھوں میں کوئی طاقت نہیں۔ صرف مسیح کے چھدے ہُوئے ہاتھوں میں طاقت ہے۔"

ایک دُکھیا ماں کی درخواست پر سادھو جی کولمبو کے ایک ہسپتال میں

گئے تاکہ اس کے بچّے کے لیے دعا کریں جو نمونیہ سے مرنے کو تھا۔ اور ڈاکٹروں نے لاعلاج سمجھ کر چھوڑ دیا تھا۔ وہ اُسی وقت سے تندرست ہونے لگا۔ یہاں تک کہ آخر بالکل اچھا ہو گیا اور ہر ایک جلسے میں شریک ہُوا۔ جب سادھو جی کو معلوم ہُوا کہ اس شفا کے بعد لوگ انہیں صحت بخشنے والا جان کر ان کے پاس آتے ہیں تو انہوں نے پوری کوشش کی کہ مسیح کی قدرت کو دیکھیں جو دعا کے بعد اس لڑکے کی شفا میں ظاہر ہوئی۔ اس کے بعد انہوں نے پکا ارادہ کر لیا کہ کبھی بیماروں کے لیے دعا نہ کروں گا۔ کیونکہ اس سے وہم پرستی کے بڑھنے کا امکان ہوتا ہے اور انجیل پر پردہ پڑ جاتا ہے۔

"مدراس کے ایک اخبار" سے سادھو جی کی تصویر کے رنگ کا پتہ چلتا ہے۔ جبکہ وہ جوگیا لباس پہنے ایک مجلس میں وعظ کر رہے تھے:-

"وہ ایک ایسا جوان ہے جو اپنا پیغام نبیوں کے سے جوش کے ساتھ سُناتا ہے۔ سُننے والوں کے کان اس کے ہونٹوں سے سِل جاتے ہیں۔ ان کی نظریں اس بولنے والی تصویر سے ایک لمحہ کے لیے بھی الگ نہیں ہوتیں۔ میرے ذہن میں جو سادھو جی کا نقشہ تھا وہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ مَیں نے جو کچھ ان کی بابت سوچا تھا وہ اس سے بہت بلند ہیں۔ مَیں نے ان کے ہونٹوں سے میٹھے الفاظ سُنے۔ وہ مشرق کی روحانی نفاست کا نمونہ تھے جو میرے روبرو کھڑے تھے۔ جس میں سے انجیل کے نور کی کرنیں نکل کر چاروں طرف پھیل رہی تھیں۔ وہ مشرقی حُسن وجمال کا اعلیٰ نمونہ تھے جسے خداوند نے اپنا کر اپنی رُوح سے معمُور کر دیا تھا۔ جس طرح سُورج کے آگے بادل کُھل جاتے ہیں۔ اُسی طرح میرے غلط عقیدے اُن کے سامنے کافور ہو گئے مسیحیت کا بھید سادھو جی نے سمجھا دیا۔"

سادھو سُندر سنگھ اگرچہ اجنبی تھے پھر بھی ہر نیا ملاقاتی ان سے گھُل مِل جاتا تھا۔ اُن کے پیارے لبوں سے اور سب سے بڑھ کر ان کی دلکش مسکراہٹ سے ان کے دلی اطمینان و خوشی کا عکس نظر آتا تھا۔ یہ سب باتیں ایسی ہیں کہ کوئی بھول نہیں سکتا۔ ایک ہندو سنیاسی نے انہیں دیکھتے ہی یہ کہا کہ "اس شخص کے چہرے سے مَیں دیکھ سکتا ہوں کہ اس نے وہ شانتی حاصل کر لی ہے جس کی تلاش میں مَیں مارا مارا پھرتا ہوں۔"

لنکا کے شہر جفنا کا ایک اخبار "مارننگ سٹار" یوں لکھتا ہے:۔

"سُندر سنگھ کے پاس غیر مسیحیوں کے لیے بھی پیغام ہے۔ اُس نے اُن کے مذاہب پر حملہ نہیں کیا۔ بُرا بھلا نہیں کہا اور نہ لعن طعن کے سخت الفاظ استعمال کیے بلکہ محبت سے اس بات کی گواہی دی جس کا مَیں مدت تک متلاشی رہا کہ کہیں مجھے اطمینان اور روحانی خوشی مل جائے لیکن میں ناکام رہا۔ اگر مجھے وہ اطمینان حاصل ہُوا تو صرف خدا کے اِس واحد ظہور سے جو مسیح میں ہے۔"

۱۳

مشرقی ممالک میں بُلایا جانا

سادھو جی کو انہی دنوں ایک دعوت ملی اور اُنہیں ملایا، برما، جاپان اور چین کے ملکوں میں بلایا گیا۔ جنوبی ہند اور لنکا میں گیارہ مہینے رہ کر کلکتہ آئے اور دو ہفتے تک بڑے بڑے جلسوں میں درس دیے۔ پھر ۲۱ نومبر ۱۹۱۸ء کو جہاز میں سوار ہو کر رنگون چلے گئے

سیام اور برما میں ایک مہینہ تک رہے۔ اِن دونوں جگہوں پر لوگ بڑے جوش اور تپاک کے ساتھ اُن سے ملے۔ پھر سنگاپور میں اچانک ہی پہنچ گئے۔ لوگوں نے جلدی جلدی ایک جلسے کا انتظام کیا۔ لیکن معلوم ہُوا کہ ان کی زبان کا ترجمہ کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ سادھو جی کو پورا یقین تھا کہ خدا نے انہیں مشرقی ملکوں میں بلایا ہے، اس لیے اگرچہ وہ انگریزی زبان نہ جانتے تھے تو بھی آپ نے ٹھان لی کہ کوشش کر کے ضرور دیکھوں گا۔ جنوبی ہند کے لوگ اور دیگر انگریزی بولنے والے انہیں انگریزی زبان بولتے سُن کر جیسے وہ سمجھ سکتے تھے، نہایت خوش ہوئے۔

وہاں سے سادھو جی ملایا میں آئے اور ایک مہینہ وہاں قیام کیا۔ جب دوبارہ سنگاپور میں آئے تو انگریزی زبان میں بہت ترقی کر چکے تھے اور انہیں انگریزی زبان کا ماہر مان لیا گیا۔ جاپان کو روانہ ہوتے وقت ان کے الفاظ یہ تھے:۔

جب مَیں انگریزی میں بولنے لگتا ہوں۔ تو میرے اندر بھونچال سا آجاتا ہے۔ جس طرح زمین کے اندر کی آگ اور لاوا جو باہر آنا چاہتا ہے، اسی طرح میرے دِل کے خیالات باہر نکلنے کے لیے دل میں ہلچل پیدا کر دیتے ہیں۔

جاپان میں بہت سے وعظ ہوئے اور بہت لوگوں نے لکھا کہ ہمیں رُوحانی برکت حاصل ہوئی ہے۔ یہاں بھی سادھو جی انگریزی میں بولتے رہے۔ ایک دفعہ اُنہوں نے کہا کہ "جب میں نے جاپان کے پروفیسروں کو انگریزی بولتے سُنا۔ تو میرے دل میں خیال آیا کہ میری ٹوٹی پھوٹی انگریزی اتنی خراب تو نہیں۔ پھر تو مَیں ہمّت کر کے مَیدان میں کُود پڑا۔"

جاپان میں ہر جگہ مادہ پرستی کا چرچا سُن کر دل پر ناموافق اثر ہُوا۔ ایک جگہ کہتے ہیں کہ سُوجھ بُوجھ اور روحانیت کے لحاظ سے ہندوستان کے لیے جاپان میں کچھ نہیں ہے۔ جاپان بے شک ایک بڑا مُلک ہے۔ لیکن اس کی موجودہ فتح نے اس کی روحانی بنیادوں کو کاری ٹھیس لگا کر بالکل ہلا دیا ہے۔ جاپان مغربی مادہ پرستی کے بھیانک طوفان میں اندھا دُھند کُود پڑا ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے مادیّت کی چکا چُوند ہے۔ جاپان روپیہ پیدا کرنے کی دُھن میں مگن ہے۔ لیکن خدا کے کلام کے لیے کان نہیں ہیں۔ وہاں کے افسوسناک حالات کا نقشہ تو یہ ہے کہ کسی بھی مذہب کا لحاظ نہیں۔ کسی سے لگاؤ نہیں۔ جاپان کے لیڈروں کے ساتھ گفتگو کرتے وقت مَیں نے مُلک کی بداخلاقی کی طرف ان کی توجہ دلائی۔ مگر اس کے جواب میں اُنہوں نے رسمی طور پر بھی افسوس کا اظہار نہ کیا۔ سب سے گئی گزری بات یہ ہے کہ جاپان بدھ مت کو بھی عزت کی نظر سے نہیں دیکھتا۔ وہاں کے مندروں میں سیّاحوں اور رہنماؤں

کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ مگر بھگتوں کا کہیں پتہ نہیں۔"

چین پہنچ کر پیکنگ کے بڑے گرجا گھر میں وعظ کیا اور پھر جنوب کو روانہ ہوئے۔ اپنے سفر اور وعظوں کا پروگرام تیار کرنے میں اُنہوں نے زیادہ وقت نہ لگایا۔ اکثر جس جگہ پہنچتے فوراً اسی روز شام کو جلسے کا بندوبست ہو جاتا تھا۔ شہر ہانکن کے ریلوے سٹیشن پر اتفاقاً ایک مشنری سے اُنکی ملاقات ہوئی۔ یہ مشنری انہیں اپنے یہاں لے گیا اور فوراً جلسہ کا انتظام کیا گیا۔ اس جگہ بھی کافی بھیڑ تھی اور ان کا پیغام بڑی خوشی سے سُنا گیا۔

۱۴

مسیح کی سنگت

سادھو سُندر سنگھ کو گذرے اٹھارہ مہینوں میں بڑی کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ جوشیلے لوگوں کے ہجوم کے ہجوم اُنہیں گھیرے رہتے تھے۔ اُن میں سے بعض تو عقیدت کے اظہار کے لیے جوش میں آکر سجدہ کرنے کو بھی تیار ہو جاتے تھے۔ عین ممکن تھا کہ سادھو جی کے سر میں غرور سما جاتا، لیکن اِس حالت میں بھی وہ اپنے خداوند کے سیدھے سادے اور فروتن شاگرد بنے رہے۔ ہم میں سے جو انہیں اچھی طرح جانتے تھے، اُنہوں نے دیکھا کہ جُوں جُوں زمانہ گذرتا گیا، وہ اپنی شخصیت میں اُونچے اور مضبوط ہوتے چلے گئے۔ غرور ہٹ دھرمی اور خود غرضی اُن میں نام کو بھی نہ تھی۔

جس وقت لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ گرد کھڑے ہو کر ان کی بڑائی کرتے، ان کے آگے جھکتے اور گھٹنے ٹیک دیتے تھے تو ان پر بڑی آزمائش آتی تھی جس کا بیان وہ اپنی کتاب "مکتبِ مسیح" میں یوں کرتے ہیں :۔

"ایک دن میں دُعا کے لیے جنگل میں نکل گیا اور وہاں بیٹھ کر سوچنے لگا کہ خدا سے کیا برکت مانگوں۔ اتنے میں ایک شخص میرے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ اس کی چال ڈھال، اس کے حلیہ اور طرزِ گفتگو سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ خدا کا سچا بھگت ہے، لیکن اُس کی آنکھ میں مکر تھا۔ اس کی باتوں میں شیطانی چال تھی۔ وہ مجھ سے کہنے لگا۔ معاف کیجیے، میں آپ کی عبادت میں خلل ڈال رہا

ہوں۔ لیکن دوسروں کی مدد کرنا میرا فرض ہے۔ آپ سے میری ایک نہایت ضروری عرض ہے۔ آپ کی پاک اور بے داغ زندگی نے مجھ پر اور دیگر ہزاروں آدمیوں پر بھاری اثر کیا ہے۔ آپ نے محض خدا کی خاطر اپنے جسم اور رُوح کو دوسری ہستیوں کے لیے قربان کر رکھا ہے۔ لیکن کسی نے آپ کی قدر نہ کی۔ یعنی آپ کے سچے رہنے سے صرف چند ہزار لوگوں پر اس کا اثر ہوا جن میں سے بعض تو آپ کا اعتبار نہیں کرتے۔ اگر آپ ہندو یا مسلم ہوتے۔ تو آپ بڑے نامی لیڈر ہوتے۔ کیونکہ ان کو آپ جیسے روحانی سردار کی تلاش ہے۔ پس آپ ان میں شامل ہو جائیے۔ تو ۳۲ کروڑ ہندوستانی آپ کو سر آنکھوں پر بٹھائیں گے۔

یہ سُنتے ہی میں پکار اُٹھا کہ "اے شیطان دُور ہو۔ میں نے تو ایک دم جان لیا تھا کہ تو بھیڑ کے بھیس میں بھیڑیا ہے۔ کیا تیری یہ خواہش ہے کہ میں صلیب کو چھوڑ دُوں؟ اور اس تنگ راستے کو جو زندگی کی طرف لے جاتا ہے ترک کر کے موت کا چوڑا راستہ اختیار کر لوں؟ میرا مالک جس نے میری خاطر اپنی جان دی، وہی میری امید اور میرا مقصد ہے۔ پس میں اپنی زندگی اور جو کچھ میرا ہے، اس کی نذر کروں گا۔ کیونکہ میرے لیے سب کچھ وہی ہے۔ اے شیطان مجھ سے دُور ہو۔ تیرا مجھ سے کیا کام؟

جب اس نے یہ جواب سُنا تو غصہ سے بڑبڑاتا چلا گیا، اور میں آنسو بہاتے ہوئے دعا میں جھک کر اپنی رُوح خدا کے حضور میں اس طرح انڈیلنے لگا۔

"میرے خدا مجھ پر رحم کی نظر کر۔ اور اپنی پاک رُوح سے مجھے معمور کر تاکہ میرے دل میں سوائے تیری محبت کے اور کسی چیز کا پیار باقی نہ رہے۔ میں تجھ سے کسی نعمت کا طالب نہیں۔ محض تجھے چاہتا ہوں۔ میں تجھ سے دنیا اور اس کے خزانوں کی خواہش نہیں رکھتا اور نہ ہی بہشت کا خواہاں ہوں۔ میرے خالق

تو نے میرا دِل اپنے لیے پیدا کیا ہے۔ میرا دل تیرے سوا کہیں چین نہیں پاتا۔ تو ہی تو ہے جس نے اس دل میں سکون و قرار کی خواہش پیدا کی ہے۔ میرے دِل سے وہ سب کچھ نکال دے جو تیرے اور تیری شان کے خلاف ہے۔ آ! اس میں داخل ہو! اس میں ہمیشہ رہ اور اس میں ابد تک حکومت کر!"

جب دُعا سے فارغ ہو کر اُٹھا تو کیا دیکھا کہ ایک نورانی خوبصورت انسان میری آنکھوں کے سامنے کھڑا تھا۔ یہ تصویر خاموش تھی۔ پہلے میری آنکھیں آنسوؤں کے سبب اسے صفائی سے نہ دیکھ سکتی تھیں۔ لیکن بعد میں اس میں سے محبت کی زندگی بخش کرنیں اس قدر زور سے نکلنے لگیں کہ میرے اندر داخل ہو کر میری رُوح کو دھو ڈالا۔ پھر میں سمجھ گیا کہ میرا نجات دہندہ میرے سامنے کھڑا ہے۔ جس چٹان پر میں بیٹھا تھا۔ وہاں سے اُٹھ کر اسکے قدموں پر گر پڑا۔ اس کے ہاتھ میں میرے دل کی کُنجی تھی۔ اپنی محبت بھری کنجی سے میرے دِل کی اندرونی کھڑکی کھول کر اپنی حضوری سے بھر دیا۔ پھر تو اندر باہر جہاں کہیں دیکھتا تھا سوا اس کے کچھ نظر نہ آتا تھا۔

اب مجھے معلوم ہؤا کہ "انسان کا دِل خدا کا تخت ہے۔ اور جب وہ دل میں رہنے کو داخل ہوتا ہے تو اسی وقت سے بہشت شروع ہو جاتی ہے۔"

یہ تھا وہ طریقہ جس کے ذریعہ سُندر سنگھ شہرت اور انسانی تعریف کی آزمائش سے بچ کر خداوند کے دُکھوں میں شریک ہوئے۔ تاکہ اپنے خداوند کی دائمی قربت کا تجربہ حاصل کریں۔

۱۵

تبّت کا دورہ

سادھو جی کو مدراس میں داخل ہونے سے پہلے یہ آزمائش پیش آچکی تھی اور وہ اس پر غالب آئے۔ اب وقت آپہنچا تھا کہ برفانی درّوں سے گزر کر لمبی سڑک کی راہ سے تبت میں داخل ہوں۔ انہیں امید تھی کہ چین کی طرف سے تبت جا سکوں گا۔ لیکن معلوم ہؤا کہ یہ ناممکن ہے۔ مدراس میں ایک دن رہ کر وہ سپاٹو کو روانہ ہوئے پھر وہاں سے کوٹ گڑھ میں آئے۔ الموڑہ میں مدراس والوں کی ایک جماعت کیلاش کے مہارشی کے درشن کے شوق میں ان کا انتظار کر رہی تھی اور کوٹ گڑھ پہنچنے پر ان لوگوں کے بارے میں خبر ملی۔ اسی جگہ سادھو جی کے پاؤں میں چوٹ لگی اور پاؤں پک گیا جس کی وجہ سے تین ہفتے کی دیری ہو گئی۔ اب جولائی کی چار تاریخ تھی اور الموڑہ جا کر اس جماعت سے ملنا بے فائدہ تھا۔ کیونکہ سفر کا وقت نکل چکا تھا۔ آپ نے یہ بھی خیال کیا کہ جنوبی ہند کے لوگ راستے کی سخت سردی برداشت نہ کر سکیں گے اس لیے اکیلے ہی روانہ ہو گئے۔

چونکہ سادھو جی کے بعض مخالف یہ دعوےٰ کرتے تھے کہ وہ تبت میں کبھی داخل نہیں ہوئے، اس لیے مسز پارکر صاحبہ نے سادھو جی کو تاکید کی کہ وُہ سفر کا بیان تفصیل سے لکھ کر بھیجیں۔ سادھو جی نے ایسا ہی کیا اور بعد میں یہ بیان ایک اخبار بنام "دیا نو دایا" میں شائع کیا گیا۔ اس سفر میں

اڑتالیس پڑاؤ تھے۔ کچھ تو چھوٹے تبت میں تھے اور کچھ اصل تبت میں۔ اس سے سفر کی مشکلات کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس بار اُن کے ہمراہ ایک تبتی مسیحی بنام تھینیا تیت بھی تھا۔ وہ بیان نیچے درج ہے:-

"سرحد سے آگے یہ ملک چالیس میل تک جنگل ہی جنگل ہے۔ اس سنسان ویرانے میں ہمیں پانچ راتیں رہنا پڑا۔ کسی رات تو درخت کے نیچے سوئے۔ ایک رات غار میں گذاری۔ جنگل سے نکل کر درخت کا نام و نشان نہ تھا۔ یہ مقام بہت بلند اور نہایت سرد تھا یہاں تک کہ گھاس تک نہ تھی۔ سولہ ہزار فٹ کی اونچائی پر ہم آسمان کے سائے تلے سوتے تھے۔ سردی کی وہ شدت تھی کہ جسم کی تمام طاقت مُردہ ہو جاتی تھی اور جسم سُن پڑ گیا تھا۔ ایک بار رات بھر موسلا دھار بارش ہوتی رہی۔ اور اس بلا کی سردی میں تمام رات ایک چھتری کے نیچے بیٹھ کر کاٹی۔ یہ جگہ سردی کے سبب سے سخت خطرناک ہے۔ بہت سے لوگ یہاں ہلاک ہو جاتے ہیں۔ پندرہ جولائی کو ہم درہ مہنگت پولا میں پہنچے جو اُنیس ہزار فٹ اونچا ہے۔ یہاں ہم نے تین آدمیوں کی لاشیں دیکھیں جو سردی سے اکڑ کر مر گئے تھے۔ اس مقام پر ہمیں سانس لینا بھی مشکل تھا۔ سر اور پھیپھڑوں میں درد ہونے لگا۔ اور دل کی دھڑکن کانوں میں سُنائی دیتی تھی۔

تبت کے ایک گاؤں بنام سُدھ کا چودھری بڑے تپاک سے پیش آیا۔ اور ایک بڑے مشہور لاما کو جو ہندوستانی جانتا تھا۔ دعوت دے کر بلا لیا کہ ان کے ساتھ مل کر کھانا کھائے۔"

اس کے بعد سادھو جی دس دیگر دیہات کا ذکر کرتے ہیں جہاں اُنہوں نے انجیل کی خوشخبری سُنائی۔ دو دن یہ لوگ گنگیا میں ٹھہرے اور چار سو لاماؤں کو خدا کا کلام سُنایا۔ اس کے بعد سادھو جی لکھتے ہیں:-

تبت میں ایک ہی قسم کی دِقتیں نہیں بلکہ کئی قسم کی سختیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہاں سڑکیں بالکل نہیں ہیں۔ دریا اور نالے بہت ہیں مگر انہیں پار کرنے کے لیے پُل نہیں ہیں۔ پانی برف کی مانند ٹھنڈا ہے۔ جہاں پانی کا بہاؤ کم ہوتا تھا ہم تیر کر پار جا سکتے تھے۔ لیکن بعض جگہوں پر پانی کی رو ایسی تیز ہوتی تھی اور دریا ایسی سخت چٹانوں میں سے گذرتا تھا کہ تیرنا ناممکن تھا۔

ایک دن دریائے مرنگ میں تیر کر مشکل سے دوسرے کنارے پر پہنچا کیونکہ پانی ایسا ٹھنڈا تھا کہ میرا تمام جسم سُن ہو کر اکڑ گیا۔ تین دفعہ تھپیڑے کھائے پر گر کر پانی میں ڈوبا اور بڑی مشکل سے ہاتھ پاؤں مار کر اس دریا سے باہر نکلا۔ سینکڑوں ہی اس دریا میں ایسے ڈوبے کہ پھر نہ نکلے۔

تبت میں ایک مصیبت خوراک کی بھی ہے۔ کئی جگہ کھانے کو کچھ نہیں ملتا۔ صرف ستو یا بھنے ہوئے جو کا آٹا۔ اور ایک قسم کی چائے جس میں نمک اور مکھن ملا ہوتا ہے، ملتی ہے۔ بھنے ہوئے جو جو ہمیں بار بار کھانے کو ملے، ایسے خراب تھے کہ اگر گھوڑوں اور گدھوں کو ملتے تو وہ بھی انہیں منہ نہ لگاتے۔ ان تمام تکلیفوں کے وقت صرف اس بات سے تسلی ملتی تھی کہ یہ مصیبت مسیح کی صلیب ہے جو رُوحوں کی نجات کے لیے نہایت ضروری ہے۔ میرے لیے مسیح نے آسمانی تخت چھوڑا اور صلیب پر بھاری دُکھ اٹھانا گوارا کیا۔ سو اگر میں ہندوستان کو چھوڑ کر تبت میں آیا کہ رُوحوں کو — — اس کے پاس لاؤں تو میں کوئی بڑا کام نہیں کر رہا۔ اگر میں نہ آتا تو کیا غضب ہو جاتا۔ بے شک یہ خدا کا حکم ہے جسے مان رہا ہوں۔"

تبت سے واپسی پر سُندر سنگھ پنجاب میں آئے اور پُرانے وطن رام پور کٹانی پہنچے۔ یہاں چند روز اپنے بوڑھے باپ کے ساتھ گذارے۔

کہتے ہیں کہ اِس دفعہ بڑے پیار کے ساتھ ان کا سواگت کیا گیا۔ اب چودہ برس تک ثابت قدمی سے مسیح کا وفادار رہنے کے بعد انہیں وہ خوشی حاصل ہوئی جو بیان سے باہر تھی۔ کیونکہ ان کے باپ نے بھی اس نجات دہندہ کے ایمان کا اقرار کر لیا جس نے اُن کے بیٹے کی پوری زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا تھا۔

سردار شیر سنگھ چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا سُندر سنگھ انہیں بپتسمہ دے لیکن یہ جان کر کہ بیٹے کا کام صرف منادی کرنا ہے، بپتسمہ دینا نہیں ہے بپتسمہ کا خیال ترک کر دیا۔ خاص کر انہیں یہ خیال ہُوا کہ ہندوستان میں کئی بھگت لوگ ایسے ہیں جو بپتسمہ کی رسم سے محروم ہیں۔

آخر کار بڑی مدت کے بعد خدا نے سُندر سنگھ کو یہ خوشی بخشی کہ ان کا باپ بھی خداوند مسیح پر ایمان لا کر نجات کی خوشی حاصل کر چکا ہے۔

۱۶

انگریزی زبان بولنے والے مُلکوں کا دورہ

جب سُندر سنگھ کو یقین ہو گیا کہ وہ انگریزی میں کافی اچھی طرح تقریر کر سکتے ہیں۔ تو ان کے دل نے گواہی دی کہ اب اُن کے سامنے کھُلا میدان ہے۔ چنانچہ ایک رات جب وہ دعا کر رہے تھے تو خدا نے کہا کہ انگلستان جاؤ۔ ہندوستان میں اکثر یہ چرچا ہوتا تھا کہ برطانیہ کے لوگ اس قدر مادہ پرست اور اخلاق کے گرے ہوئے ہیں کہ مسیحیت کی قوت ان کی زندگی میں باقی نہیں رہی۔ سادھوجی کی خواہش تھی کہ اس حقیقت کو معلوم کریں۔ انہوں نے محسوس کیا کہ خدا انہیں اس مُلک کی طرف بُلا رہا ہے۔

اُن کے باپ کی مدد سے یہ سفر ممکن ہو گیا اور ۱۶ جنوری ۱۹۲۰ء کو بمبئی سے جہاز میں سوار ہو کر آپ لور پول کو روانہ ہو گئے۔ آپ نے اس یورپی دَورے کی کوئی تیاری نہ کی تھی۔ ابھی آدھا سفر بھی طے نہ کر پائے تھے کہ اُن کے سفر کی خبر انگلستان میں ان کے دوستوں کو جا پہنچی۔ الغرض یہ دراز قد اکیس سالہ جوان سادھو ننگے پاؤں لمبے کا چوغہ پہنے ساحل برطانیہ پر اُترا۔ اور چھ ہفتے کے اندر اندر ان کی تقریروں کی شہرت اس قدر پھیل گئی کہ جہاں لوگوں کو معلوم ہوتا کہ سادھوجی یہاں وعظ کریں گے۔ وہ ایسے ذوق و شوق سے آتے کہ بڑے بڑے گرجے اور وسیع ہال کھچا کھچ بھر جاتے ان کا کلام سننے کو ہر قسم کے لوگ کھینچے چلے آتے تھے۔ کوئینز ہال، سٹی ٹیمپل،

ویسٹ منسٹر، چیپل جیسی مشہور جگہوں میں ان کے درس ہوئے۔ آکسفورڈ اور
کیمبرج جیسے کالجوں میں انہوں نے تقریریں کیں۔ انگلستان کی ملکہ نے اپنے
یہاں چائے کی دعوت دی۔ مگر انہوں نے بڑے افسوس کے ساتھ یہ کہہ کر معذرت
کی کہ میں عین اسی وقت ایک جماعت کے سامنے بولنے جا رہا ہوں اور میں
انہیں مایوس کرنا نہیں چاہتا۔

سادھو جی جب اپنا سادھوانہ لباس پہنے بازاروں میں پھرتے تھے تو
لوگوں کو عجیب مگر ممتاز معلوم ہوتے تھے۔ اس لیے اکثر ایک برساتی کوٹ
پہن لیتے تھے۔ اس وقت کی ایک کہانی سادھو جی بڑے دلچسپ ڈھنگ سے
سُنایا کرتے تھے۔

ایک روز وہ اپنے دو دوستوں کے ساتھ لندن شہر کی دھند میں سے
گزر رہے تھے۔ ایک جگہ راستے کے کنارے تینوں دوست بات چیت کرتے
کرتے ٹھہر گئے۔ اسی وقت کوئی عورت چٹھیاں ڈالنے نکلی۔ دھند میں سادھو جی
کا لال سا چوغہ دیکھ کر سمجھی کہ یہ ڈاک کا بمبا ہے۔ سو وہ خط ڈالنے کو آگے
بڑھی۔ مگر جب دیکھا کہ بمبا حرکت کرتا ہے تو حیران رہ گئی۔ سادھو جی نے
ہنس کر کہا "لائیے چٹھیاں مجھے دے دیجئے۔ میں ڈاک میں ڈال دوں گا"۔

تین مہینے انگلینڈ میں رہ کر ان کا علم اور تجربہ بڑھ گیا۔ وہ بہت سے نامی
گرامی لوگوں سے ملے اور دوستانہ گفتگو کی۔ انہوں نے اس بیان کو صحیح پایا کہ
مغربی طریقِ زندگی میں کچھ ایسا حصہ ہے جو محض دہریت اور مادہ پرستی سے
واسطہ رکھتا ہے۔ لیکن وقت گزرنے پر وہ ہمیشہ یہ بات کہتے تھے کہ بہت
سے گھروں میں جہاں مجھے ٹھہرنے کا اتفاق ہوا، وہاں سادہ اور خدا پرست
لوگوں کو دیکھ کر میرا دل ان کی سچی عقیدت کا بھی قائل ہو گیا۔

انگلستان سے جہاز میں سوار ہو کر امریکہ پہنچے۔ بڑے بڑے جلسوں
میں تقریریں کیں۔ اس ملک میں دولت کے حصول کے لیے جو زبردست دوڑ
دھوپ دیکھی تو دل پر بہت گہرا اثر ہوا کیونکہ وہاں کی زندگی میں چین اور
اطمینان کا نام و نشان نہ تھا۔ سادھو جی ایک جگہ کہتے ہیں کہ "اگر مسیح ان لوگوں
کو دیکھے تو ضرور کہے کہ "اے سونے سے دبے ہوئے لوگو! تم میرے پاس
آؤ۔ تو میں تمہیں آرام دوں گا، خدا کے لوگ تمام دنیا میں ہیں اور مغرب میں
بھی اس کے گواہ موجود ہیں"۔

متحدہ ریاستہائے امریکہ میں دو ماہ رہ کر وہ آسٹریلیا پہنچے۔ اس جگہ
بڑی گرمجوشی سے ان کا استقبال ہوا اور بڑے بڑے شہروں میں لوگوں پر
گہرا اثر ہوا۔

١٧

واپسی

سُندر سنگھ ۱۲ ستمبر ۱۹۲۰ء کو بمبئی واپس آ گئے۔ مدراس اور جنوبی ہند کے دیگر مقامات پر اُن کے استقبال کی بڑی تیاریاں کی گئیں۔ اُن دنوں ہندوستان میں قومی تحریک زوروں پر تھی اور قوم پرست مسیحی اس موقع کو خاص طور پر منانا چاہتے تھے۔ اشتہاروں میں ان کی نسبت ایسی ایسی سُرخیاں لکھی گئیں کہ "وُہ مرد جس نے مغرب پر فتح پائی" وغیرہ۔ لیکن جب سادھو جی کو کولمبو میں ان واقعات کا علم ہُوا تو وہ وہیں سے کھسک گئے اور بعد میں انہیں لکھا:۔

"مَیں نے کولمبو میں سُنا تھا کہ جنوبی ہند میں میرے استقبال کی بڑی شان سے تیاریاں کی جا رہی ہیں۔ مَیں اپنے مسیحی بھائی بہنوں کی محبت کے لیے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ جب میرے لیے ایسی تیاریاں کی جاتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ صلیب ہے جس کے بوجھ کو برداشت کرنا میرے لیے بہت مشکل ہے۔ بھوکا رہنا یا اس کی خاطر قید کی سختی سہنا زیادہ آسان ہے۔ لیکن یہ صلیب بہت بھاری ہے، اس لیے آپ کو بغیر اطلاع دیے مَیں سیدھا بمبئی پہنچ گیا ہوں۔"

بمبئی سے آپ دعا اور آرام کے لیے سپاتُو چلے آئے۔ لگاتار تقریروں کی مصروفیت اور بڑے بڑے شہروں کی گہما گہمی انہیں کبھی نہ بھائی۔ ان کا دل تنہائی میں اپنے خداوند کے ساتھ رہنے کو ہمیشہ ترستا تھا، اس لیے ایک ایسی

مرکزی جگہ کی ضرورت محسوس ہوئی، جہاں اس غرض کے لیے کبھی کبھی آ جایا کریں۔ سپاتُو بازار میں ایک سکول کی پرانی عمارت تھی وہی خرید لی۔ اور سفر سے جو فرصت کا وقت ملتا تھا یہیں گزارتے تھے۔ کوئی پانچ برس تک یہ عمارت اُن کا گھر بنی رہی۔ مکان کے پیچھے جو سیدھے سادے کمرے تھے۔ ان میں تسلی اور اطمینان کے ساتھ رہتے تھے۔ زیادہ تر وہ کتابیں پڑھتے رہتے تھے جو اُن کے دوست بھیجتے تھے۔

اگرچہ ان کی خط و کتابت کا سلسلہ بڑا وسیع تھا۔ تاہم خطوں کے جواب میں ہمیشہ وقت کے پابند رہتے تھے۔ ہندوستان اور ولایت کے اخباروں کی طرف سے مضامین کے لیے اکثر مانگ آتی رہتی تھی۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں بیٹھ کر قلم اُٹھایا اور یہیں اپنی پہلی کتاب لکھی۔ اِسی جگہ بہت سے مسیحی اور غیر مسیحی اُن کے پاس آیا کرتے تھے کہ وہ انہیں پھر سے خدا کا راستہ دکھائیں۔ اسی مقام سے وہ تازہ دم ہو کر ہندوستان کے دُور دراز کے شہروں میں جلسوں پر پہنچتے اور تقریریں کرتے تھے۔ ان دِنوں ان کی زندگی میں خاموش مصروفیت تھی۔

دسمبر کے مہینے میں بنگال اور پنجاب میں لوگوں کو خدا کا کلام سنایا اور تبت کے سرحدی دیہات کو روانہ ہو گئے۔ مسٹر رائیٹ جو سفر میں ان کے ساتھی تھے راہ میں بیمار ہو گئے اور کوٹ گڑھ میں لائے گئے اور سادھو جی کو اکیلے ہی آگے جانا پڑا۔

۱۸

یورپ سے دوبارہ دعوت

یورپ میں بہت سے لوگ پھر اُن کا پیغام سُننا چاہتے تھے جن سے باربار دعوتی خط آتے رہتے تھے، اِس لیے ۲۹ جنوری ۱۹۲۲ء کو بمبئی سے مصر کی طرف روانہ ہوئے اور وہاں سے ریل کے ذریعہ فلسطین پہنچے۔ گو اُن کے باپ نے اس سفر کا خرچ دیا تھا۔ پھر بھی سر ولیم ولکوکس نے جو اینگلو انڈین اور مشہور انجینئر تھے انہیں اپنے ہاں ٹھہرا کر ان کی مہمان نوازی کی۔

اُن پہاڑیوں پر چلنا جن پر خداوند چلا تھا، ہیکل میں کھڑا ہونا، باغ کے اندر قبر کا دیکھنا۔ گتسمنی باغ میں دُعا کرنا اور ناصرت، تبریاس اور جھیل گلیل کو دیکھنا، ان ساری باتوں سے وہ بہت خوش ہوتے تھے۔ ہر قدم پر اپنے خداوند کی نزدیکی حضوری کا احساس ہوتا تھا۔ ان کا دِل گواہی دیتا تھا کہ وہ بھی اس کے چھوٹے سے گروہ میں شریک ہیں جس سے خداوند نے کہا تھا کہ "میں تمہیں اطمینان دیے جاتا ہوں۔ اور جس طرح باپ نے مجھے بھیجا ہے۔ مَیں تمہیں بھیجتا ہوں۔" انہیں یہ بھی محسوس ہُوا کہ اب جو انہیں یہ نیا کام پیش آیا ہے، یہ دراصل اپنے تجربوں کی گواہی دینے کا کام ہے کہ جو کچھ انہوں نے دیکھا اور سُنا ہے، تمام دُنیا کو بتائیں۔

مارسیلز کی بندرگاہ پر اُتر کر وہ فوراً سوئیٹزرلینڈ پہنچے۔ جہاں کہیں گئے لوگ بڑے جوش و تپاک سے ملے۔ ایک دن ایک میدان میں تین ہزار لوگوں کے سامنے

تقریر کی۔ نوشَیٹل میں دس ہزار نے ان کا وعظ سُنا۔ جنیوا میں بین الاقوامی ہال کے اندر پیغام پیش کیا۔

جرمنی میں آپ نے چھ شہروں کا دَورہ کیا اور بڑے بڑے جلسوں میں تقریریں کیں۔ لیکن یہ دَورہ بہت جلدی جلدی کیا گیا۔ سویڈن میں داخل ہوئے تو شہزادہ اوسکر برناٹ کے مہمان ہوئے اور پھر آرچ بشپ سوڈربلوم کے ہاں ٹھہرے۔ پھر تھوڑے عرصے کے لیے ناروے ڈنمارک اور ہالینڈ بھی گئے۔

اِس دَورے کے وقت یورپ میں سادھوجی کا چرچا بہت زیادہ تھا۔ اُن کا نقش لوگوں کے دِلوں پر جم گیا۔ ان کی تعلیم سے ہزاروں پر یہ حقیقت کھُل گئی کہ مسیح زندہ ہے اور وہی ہمارا مُکتی داتا ہے۔

یورپ میں نام کے مسیحیوں کی دنیاداری سے اور ان مُلکوں کے بہت سے لوگوں کی بے دینی اور بد اخلاقی سے سادھوجی کو بہت صدمہ پہنچا۔ جُوں جُوں دن گذرتے گئے اُن کا لب و لہجہ نبیوں کا سا ہوتا گیا اور یورپین قوموں کی مادہ پرستی اور عیش طلبی کو دیکھ کر انہیں روزِ قیامت کا خوف ڈرانے لگا۔ وہ کہتے ہیں :-

"غیر مسیحی ہاتھ کے بنائے ہوئے بُتوں کی پُوجا کرتے ہیں۔ مگر اِن مُلکوں میں جو مسیحی کہلاتے ہیں وہ اپنی پُوجا آپ کرتے ہیں۔ ایسی نفس پرستی اور تن پروری بدترین بے دینی ہے۔

جب تم مسیح کو جلال میں دیکھو گے تو ماتم کرو گے کہ ہم کیوں اس کو اپنا خدا سمجھ کر ایمان نہ لائے۔ لیکن اس وقت کا پچھتانا بے کار ہوگا۔ تم نے ان بے دین لوگوں کی پیروی کر کے خود کو گمراہ کر لیا جو اپنی عقل کے فریب میں آ کر کہتے ہیں کہ مسیح کی اُلوہیت کو نہ مانو۔ یاد رکھو۔ اُس وقت کی توبہ کسی کام نہ آئے گی۔ شاید

اس دن تم سے یہ کہا جائیگا کہ ایک غیر مسیحی ملک کا آدمی تمہارے پاس آیا۔ اُس نے میرے زندہ ہونے کی گواہی دی۔ کیونکہ اس نے میری قدرت اور جلال کا تجربہ خود کیا تھا۔ پھر بھی تم نے اس کا یقین نہ کیا۔"

چونکہ سُندر سنگھ اپنی گواہی دے چکے تھے۔ اور کام کو تمام کر چکے تھے۔ اس لیے وُہ کہتے ہیں:۔

"یہ پہلا اور آخری وقت ہے کہ تم مجھے دیکھتے ہو۔" یہ الفاظ انہوں نے سُننے والوں کے سامنے بار بار دُہرائے۔ جب لگاتار تقریروں اور لیکچروں سے جسم تھک کر چُور ہو گیا اور مایوسی سے دِل ٹوٹ گیا تو جہاز میں سوار ہو کر انگلستان چلے آئے۔ اور وہاں دو جلسوں میں تقریریں کیں اور اس کے بعد ہندوستان کا رُخ کیا۔

ایسی مسیحی اقوام کی خوشامد اور تعریف کی بہ نسبت جن کو زندہ خداوند کی حضُوری کا کچھ بھی علم نہ تھا، انہیں خداوند کی ہمراہی میں تبت کے راستے کی سختیاں زیادہ خوشگوار معلوم ہوتی تھیں۔ وہ کہتے ہیں: "تبت میں مرنے کے خیال سے مجھے مطلق خوف نہیں آتا۔ جب وہ دن آئے گا۔ مَیں خوشی سے اس کا استقبال کروں گا۔ مَیں ہر سال تبت جاتا ہوں۔ شاید اگلے سال تم سُن لو گے کہ مَیں نے وہاں جان دے دی۔ اُس وقت یہ خیال نہ کرنا کہ سُندر سنگھ مر گیا بلکہ کہنا کہ وہ ہمیشہ کی زندگی میں یعنی بہشت میں داخل ہو گیا۔ وہ مسیح کے ساتھ کامل زندگی بسر کر رہا ہے۔"

19

تقریر کی بجائے تحریر

یورپ کے دَورے کے بعد سُندر سنگھ اس قابل نہ رہے کہ پہلے کی طرح گھوم پھر سکیں۔ مہینوں بڑی بڑی جماعتوں کے سامنے لگاتار بولتے رہنے سے جسم ایک دائمی مرض کا شکار ہو چکا تھا۔ اس کی وجہ سے سفر اور منادی سے تھکاوٹ ہو جاتی تھی۔ ان کو بتایا گیا کہ "آپ کے پھیپھڑے کمزور ہو چکے ہیں اور دِل کی حالت بھی خراب ہے۔" ان امراض کے سبب ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۹ء تک اُنہیں سخت تکلیف اُٹھانی پڑی۔ کئی بار تو موت کے قریب ہی پہنچ گئے تھے۔ دل کی کمزوری بڑھ گئی جس کی وجہ سے برابر ایک دن رات بے ہوشی کی حالت میں پڑے رہے۔ تھکاوٹ سے اکثر دِل کمزور ہو جاتا تھا۔ کئی بار مَیں صبح کو انہیں دیکھتا تو چہرہ زرد اور اُترا ہُوا دکھائی دیتا تھا۔ اور وہ ساری ساری رات درد کی حالت میں پڑے بلبلایا کرتے تھے۔

اس حالت میں جب کوئی کنونشن آ پڑتی تھی تو وعظ کرنے کے متعلق پکّا وعدہ نہ کرتے تھے۔ بعض دفعہ لوگ مایوس ہو کر چلے جاتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ تکلیف ان کے جسم میں کانٹا ہے جو نرمی اور حلیمی کو قائم رکھنے کے لیے کھٹکتا رہتا ہے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ "مَیں نے اِس تکلیف کے دُور کیے جانے کے لیے دُعا کی ہے۔ اِس کا جواب یہ ملا کہ اس کو برداشت کرنا ہی پڑے گا۔ بس تھوڑی دیر اور باقی ہے۔"

ان دنوں خدمت کا ایک اور راستہ ان کے لیے کھُل گیا تھا۔ پرچوں
اور اخباروں کے ایڈیٹر مضامین کے لیے درخواستیں بھیجنے لگے۔ لہٰذا انہوں
نے اپنا پیغام لکھ کر بھیجنا شروع کر دیا۔ ۱۹۲۲ء میں ان کی پہلی کتاب "مکتبِ
مسیح" چھپ گئی۔ اس کے بعد ۱۹۲۳ء میں "مذہب اور حقیقت"، "دُرِ حقیقی"
اور اس کے بعد "دُرِ حکمت" اور "حقیقی زندگی" اور "رُوحانی عالم کی رویا" اور
آخر میں "بغیر مسیح اور اس کے ساتھ"۔ یہ کتابیں ۱۹۲۸ء تک چھپتی رہیں۔ اور
انہیں بہت پسند کیا گیا۔ بعض تو سات سات بار چھپوائی گئیں۔ اِن کتابوں کا
اور ان کے بعض حصّوں کا ترجمہ چالیس سے زیادہ زبانوں میں ہو چکا ہے۔
جہاں بھی وہ گئیں لوگوں کے لیے مسیح کے پاس پہنچنے کا وسیلہ بن گئیں۔

سُندر سنگھ کی باتوں میں گہرائی اور زبان میں صفائی تھی۔ انہوں نے
جو کچھ بھی کہا اور لکھا، کامل یقین کے ساتھ کہا اور لکھا۔ کبھی کبھی مَیں ان سے
کوئی عبارت یا جملہ بدلوانا چاہتا تھا مگر وہ ہمیشہ اپنی بات پر ڈٹے رہتے تھے۔
دراصل ان کی تحریر میں رویا میں دیکھا ہُوا حال ہُوا کرتا تھا۔ وہ اِس بات کو
خوب جانتے تھے کہ انہیں کیا کہنا ہے۔ ایک دفعہ مَیں نے صلاح کے طور پر
کہا کہ جو دلیل آپ پیش کر رہے ہیں، وہ کمزور ہے۔ اس پر جواب دیا کہ
"مجمع کے سامنے وعظ کرتے وقت مَیں نے اکثر دیکھا ہے کہ وہ دلیلیں جنہیں
مَیں قائل کرنے والی سمجھتا ہوں کمزور ثابت ہوتی ہیں اور جنہیں کمزور سمجھتا ہوں اکثر وہی دلیلیں
لوگوں کو قائل کر دیتی ہیں۔ پس جس طرح بات چلتی ہے، چلنے دو۔"

اپنی کتاب "رویا" کو دُنیا کے سامنے پیش کرتے وقت وہ اپنے آپ
پر ایک بھاری بوجھ محسوس کرتے تھے۔ اُنہوں نے مجھے لکھا کہ اس کے چھپنے
سے میرے دل کا بوجھ اُتر جائے گا اور جان میں جان آجائے گی۔ اُسی سال دسمبر
میں دل کے مرض کا تین بار حملہ ہُوا۔ اس کے بعد مارچ ۱۹۲۶ء میں انہوں
نے کہا کہ مجھے اس کتاب "رویا" کے ترجمہ کرنے کے متعلق بڑی فکر لگی ہے۔ یہ کام
ہو جائے تو پھر چاہے مَیں مروں یا زندہ رہوں کچھ فکر نہیں۔ ان کے دوستوں
نے صلاح دی تھی کہ "وہ اپنی کتاب کی چھپوائی کے معاملہ کو کچھ دیر کے لیے ملتوی
کر دیں تو اچھا ہوگا کیونکہ مخالفت کا ڈر تھا۔" مگر آپ نے جواب میں کہا کہ بارش
اناج کے فصلوں اور کانٹے دار جھاڑیوں دونوں کو سیراب کرتی ہے۔ اگر خُدا
دونوں کو فائدہ پہنچانا چاہتا ہے تو مجھے فوراً کتاب چھپوا دینی چاہیئے۔

۲۰

نُکتہ چِینی

۱۹۲۵ء میں اُنھوں نے سپاٹو میں مشن کا ایک پُرانا بنگلہ خریدا۔ یہ گھر چھاؤنی کے دوسرے مکانوں سے دُور چیل کے درختوں کے درمیان ایک خاموش اور تنہائی کی جگہ میں تھا۔ اس کے سامنے نظارہ نہایت خوبصورت تھا۔ یہاں سادھُو جی کو وُہ امن اور چین نصیب ہُوا جو شہر کی چیخ وپُکار میں جہاں لوگ کرخت آواز سے چلّا چلّا کر بولتے اور جھگڑتے تھے، مِلنا مشکل تھا۔ ایک ہندوستانی ڈاکٹر اور ان کی بیوی سادھُو جی کی ضرورت کے وقت ان کے کام آتے تھے۔ اس لیے کچھ عرصہ بعد انہوں نے وہ بازار والا مکان ان کی خدمات کے عوض میں ان دونوں کے نام کر دیا۔

۱۹۲۵ء میں جب وہ سپاٹو کی پچھمی پہاڑیوں میں سفر کر رہے تھے تو اُنکی بائیں آنکھ کے پردے پر چھوٹے چھوٹے دانے سے اُٹھ کر زخم بن گئے۔ سپاٹو میں واپس آکر علاج کرواتے رہے مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ آخر ان کی آنکھ کی روشنی و طاقت عنقریب جاتی رہی۔

اِن دنوں جرمنی اور سوئٹزرلینڈ میں ان کی بابت ایک بڑا جھگڑا اُٹھ کھڑا ہو گیا۔ بعض لوگ کہتے تھے کہ "سادھُو محض ایک مکّار آدمی ہے۔ اور وہ تبت وغیرہ کبھی نہیں گیا۔ اور اُس کے تجربے اُس کے وہمی دماغ کے خیالی ڈھکوسلے ہیں۔ اور یہ بھی کہتے تھے کہ نہ اس نے روزہ رکھا اور نہ ہر دوار گیا ہے۔" بعض اُن

پر یہ الزام لگاتے تھے کہ "جو روپیہ اسے تبت میں سکول کھولنے کے لیے دیا گیا تھا، اس میں بے ایمانی کر کے بنگلہ خریدنے پر خرچ کر دیا ہے۔" اس قِسم کے جھُوٹے الزاموں میں دارجلنگ کے ایک رومن کیتھولک پادری صاحب نہایت سرگرمی سے حِصّہ لے رہے تھے۔ اس پر جرمنی کے شہر مار برگ کے پروفیسر ہیلر صاحب نے ہندوستان سے یقینی گواہیاں جمع کر کے ایک کتاب چھپوائی جس میں اِن الزاموں کی تردید کی گئی اور سادھُو جی کی سچائی کے ثبوت پیش کیے گئے۔

رومن کیتھولک کلیسیا میں سادھُو جی کے بارے میں دو قسم کے خیالات تھے۔ ایک جماعت تو یہ کہتی تھی کہ "ایسا رسُول جو رویا دیکھے، وہ سوائے ہماری کلیسیا کے اور کہیں پیدا نہیں ہو سکتا۔" یہ جماعت ان کی قدر و عزت گھٹانے پر کمر باندھے ہوئے تھی۔ دوسری جماعت یہ مانتی تھی کہ "سادھُو جی رسُولوں کے اُس سلسلہ میں سے تھے جن کو اِس قسم کی رویائیں دی جاتی ہیں۔" اس لیے اِس جماعت کا خیال تھا کہ سادھُو جی کو رومن کیتھولک کلیسیا میں لانا چاہیے۔ چنانچہ انہیں اپنی طرف لانے کے لیے اُنہوں نے سر توڑ کوشش بھی کی تھی۔

اسی زمانے میں ایک گمنام چِٹھی اُن کے پاس آئی جس کا ان کے دل پر کچھ اثر ہُوا۔ وہ کِسی ایسے شخص کی کارروائی معلوم ہوتی تھی جس کا سر پھِرا ہُوا تھا۔ اِس خط میں لکھا تھا "یا تو تم رومن کیتھولک بن جاؤ، نہیں تو تمہیں چند ماہ کے اندر اندر قتل کر دیا جائے گا۔" اِس سازش کا کھٹکا اُن کے دِل میں ایسا بیٹھا کہ جب وہ ۱۹۲۷ء میں تبت جانے لگے تو اپنا ارادہ کِسی پر ظاہر نہ کیا۔

ہندوستان میں ہمیں سادھُو جی کو بے گناہ ثابت کرنے کی ضرورت نہیں

ہے۔ کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ وہ واقعی کئی دفعہ تبت گئے اور انہوں نے سچ مچ تکلیفیں بھی اُٹھائیں، اور ۱۹۱۳ء میں اُنہوں نے حقیقت میں روزہ بھی رکھا۔ وہ بڑے دانا اور عقل مند شخص تھے۔ اُنہیں نہ تو کوئی دماغی مرض تھا اور نہ ہی اُن کی عقل میں فتور تھا۔ ہم پر یہ بھی روشن ہے کہ وہ ریاکار نہ تھے بلکہ مسیح کے کامل فرماں بردار تھے۔ اور اُن کو خدا نے اپنے جلال کے لیے استعمال کیا تھا۔ رہا تبت کے سکول کے روپے کا معاملہ تو اس کے متعلق ان کا اپنا بیان یہ ہے کہ "الائینس بنک آف شملہ کے دیوالیہ ہونے سے پہلے یہ سرمایہ دو تین ہزار کے لگ بھگ تھا۔ مَیں نے کبھی ایک پائی بھی اِس گھر کے لیے یا اپنی ضروریات کے لیے اس روپے میں سے نہیں لی۔"

۷ اپریل ۱۹۲۷ء کو جب تبت جانے کو تھے تو انہوں نے مجھے ایک خط لکھا۔ اُس میں اپنا تمام کاروبار میرے سپرد کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "جس روپے سے مَیں نے مکان خریدا تھا، اس کی تفصیل یوں ہے۔ کچھ روپیہ کونٹ کوف نے گھر خریدنے کے لیے دیا تھا۔ کچھ روپیہ میرے ذاتی حساب میں سے تھا۔ لیکن چونکہ میرا کچھ ذاتی روپیہ فکسڈ ڈیپازٹ میں تھا۔ اس لیے رائلٹی اکاؤنٹ سے روپیہ نکالنا پڑا۔ اور جب فکسڈ ڈیپازٹ سے روپیہ آیا تو وہ پھر اُسی حساب میں جمع کرا دیا گیا۔ یہ گھر میں نے اپنے آرام کے لیے خریدا تھا۔ تاکہ خداوند کی خدمت کر سکوں۔ اور اب یہ گھر اور تمام روپیہ تبت جانے سے پہلے خداوند کے کام کے واسطے وقف کرتا ہوں۔"

اِن الزاموں کے سبب سادھو جی کا رویّہ ایسا ہی تھا جیسا کہ کسی صابر ایمان دار کا ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ خدا ہی آخرکار مجھے بے قصور ثابت کر دکھائیگا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "جو کچھ میرے عزیز دشمن میرے خلاف کر رہے ہیں

مجھے اس کی کوئی شکایت نہیں اور نہ غم ہے مثل مشہور ہے کہ کُتوں کے بھونکنے سے قافلہ نہیں رُک جاتا۔ حقیقت در اصل یہ ہے کہ خدا نے کچھ مصلحت سمجھ کر شیطان کو یہ کارروائی کرنے دی ہے جس کا انجام کسی وقت روشن ہو جائیگا۔"

ایک دفعہ مَیں نے مناسب جان کر اُنہیں لکھا کہ "فلاں جھگڑے میں نہ پڑنا۔" تو اس کے جواب میں لکھتے ہیں:۔

"مجھے اِس نکتہ چینی کی ذرا بھی پرواہ نہیں ہے۔ کیونکہ خدا جانتا ہے کہ میں باوجود اپنی کمزوریوں کے اس کا تابعدار رہا ہوں۔ اِس لیے نتیجہ آخر میں تسلی بخش ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ وُہ ایسی باتیں ہونے دیتا ہے۔ میں اپنی کمزوریوں کو جانتا ہوں اور یہ بات میرے آسمانی باپ سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ میری تمام زندگی کا مقصد یہی رہا ہے کہ اپنی جوانی کے دن خدا اور اس کے نام کے لیے انسانوں کی خدمت میں گذار دُوں۔ آگے اُس کی مرضی۔ مَیں سب کچھ اُسی پر چھوڑ رہا ہوں۔"

۲۱

ایک رویا کا کچھ حصّہ

رویا کا ذکر سننے سے کئی سال پہلے میں سادھو جی سے واقفیت حاصل کر چکا تھا۔ جب وہ رویا دیکھنے لگے تو وہ ان کا ذکر اکثر سُنایا کرتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ "فردوس اس جہان کے گرداگرد ہے اور تمام کائنات اس کے اندر ایک آبادی ہے۔ وہ اس جہان کی مانند ہے۔ مگر بے حد خوشنما اور سُندر ڈھنگ سے بنی ہے۔ اس میں کوہستان ہیں جہاں سبزہ لہلہاتا ہے، درخت اُگے ہوئے اور پھول لگے ہیں۔ جھیلیں موجود اور دریا بہتے ہیں۔ مگر ہر چیز سے خوبصورتی چمکتی ہے۔ ہر شے سے رُوح تسلی پاتی ہے۔ وہاں کی چمک دمک دیکھنے کے بعد اس فانی دُنیا کی چیزیں بے نُور اور بے رنگ نظر آتی ہیں۔ بہشتی رُوحوں کے جسم صاف شفاف ہیں۔ ان کے خیالات ان کے دلوں کے اندر سے صاف دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے جسموں میں سے آر پار دُور تک دکھائی دیتا ہے۔ وہ مختلف رنگوں میں لپٹی رہتی ہیں اور خوش رنگ اور مزہ دار پھل کھاتی ہیں جن کی خوشبو سے اردگرد کی ہوا مہک اُٹھتی ہے۔

ایک دفعہ مجھے غسل کی خواہش ہوئی۔ اُسی وقت ایک حوض جس کے کنارے کنارے خوبصورت درخت اور پھول لگے تھے، دکھائی دیا۔ پانی تازہ اور خوشبودار تھا۔ اس میں نہانے سے جو سکون ملا، وہ بیان سے باہر ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ پہلے پہل خدا بہشت میں نظر نہیں آتا۔ لیکن جب رُوحوں کا علم دھیرے دھیرے بڑھ جاتا ہے اور وہ بڑے فرشتوں کی مانند ہو جاتی ہیں تو خدا کا دیدار کر سکتی ہیں۔ مگر شروع شروع میں اس کی تجلی کو برداشت نہیں کر سکتیں۔ میں بھی خدا کی تجلی کے سامنے نہ ٹھہر سکا۔ مسیح تخت پر ہے مگر عجیب بات یہ دیکھنے میں آئی کہ جہاں بھی نظر ڈالو مسیح ہی مسیح دکھائی دیتا ہے۔ ایک طرف ایک بڑا گروہ اس کے سامنے حمد و تعریف میں مصروف ہے اور وہ ان کے درمیان موجود۔ دوسری طرف بچوں کی جماعت اُس کے سامنے اس کی بڑائی میں لگی ہے اور وہ ان کے درمیان کھڑا ہے۔"

ایک دفعہ ہاف مین کی مشہور تصویر "راہِ حق اور زندگی میں ہوں" اُن کے کمرے میں لٹک رہی تھی۔ سادھو جی نے اس کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "جس طرح مسیح اس تصویر میں ہے۔ میں رویا میں اسے ایسا ہی دیکھ سکتا ہوں" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ گرد و نواح کی عام چیزیں ان کی روحانی رویا کی تشریحوں میں کس طرح اپنا رنگ دکھاتی تھیں۔ "پاک رُوح نور اور محبت کی لہروں کی مانند ہے، جو تخت سے نکلتی ہیں اور لوٹتی ہوئی کائنات کی انتہا میں پہنچتی ہیں۔ جہاں جہاں بھی جاتی ہیں، شانتی اور آنند اپنے ساتھ لے جاتی ہیں۔

وہاں لوگوں کی شکل و صورت وہی رہتی ہے جو اس دُنیا میں ہوتی ہے۔ چھوٹے بچوں کو اُن کے رشتہ دار لے لیتے ہیں یا کوئی اور شریف عورت انہیں لے کر بڑی محبت اور خبرداری سے ان کی دیکھ بھال کرتی ہے جب ان بچوں کے عزیز آ جاتے ہیں تو اُن کے سپرد کر دیے جاتے ہیں۔

یہاں کے لوگ حمد و ثنا گانے میں اپنا وقت گذارتے ہیں یا زمین والوں کی مدد کرتے رہتے ہیں۔ یہ خدمت گذار رُوحیں غیبی طور پر دنیا کے لوگوں کو گناہ سے دُور رہنے میں مدد دیتی ہیں اور خطرے کے وقت اُن کے کام آتی ہیں۔"

سادھو نے شیطان کو نہیں دیکھا۔ لیکن دوزخ کی جھلک دیکھی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "دوزخ ایسی جگہ ہے جہاں رُوحیں بے قرار اور بے چین رہتی ہیں۔ خدا کے جلال کا وہ نور جس سے سب کچھ روشنی میں آجاتا ہے۔ ان کے لیے عذاب اور جہنم ہے۔ اس نُور میں اُن کے تمام گناہ اور ناپاکیاں ظاہر ہو جاتی ہیں۔ پھر انہیں اپنے آپ سے گھِن آنے لگتی ہے۔ وہ کوشش کرتی ہیں کہ اس نُور سے دُور دُور رہیں۔ اگر وہ بہشت میں داخل ہو بھی جائیں تو وہ ان کے لیے وبالِ جان بن جائے۔ اور وہ پہلے سے بھی زیادہ بے قراری اور دُکھ میں گرفتار ہو جائیں۔"

سادھو جی نے وہاں پوچھا کہ اس آیت کے کیا معنی ہیں۔ "جہاں اُن کا کیڑا نہیں مرتا اور آگ نہیں بجھتی۔" تو انہیں بتایا گیا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح آگ لکڑی کو جلا دیتی ہے اور پیچھے صرف راکھ رہ جاتی ہے۔ اسی طرح وہ جلتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ ناپاک رُوحوں کا بدی سے بھرا ہُوا حصہ جل جاتا ہے اور وہ پاک بن جاتی ہیں۔ کوئلے کی طرح ہزارہا سال کے بعد ہیرے کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔" پھر انہوں نے دوسری موت کی بابت دریافت کیا تو جواب مِلا کہ اس کے معنی ہیں "موت اور سزا کا خاتمہ"۔

سادھو جی کہتے ہیں کہ "ان رویاؤں کی خوشی اور تجلّی میرے دِل پر ایسی نقش ہوئی کہ جو کچھ دیکھا تھا، اس کا ایک نکتہ بھی نہیں بھُول سکتا۔"

لیکن روحانی حقیقتیں جو اُنہوں نے دیکھی اور سُنی تھیں۔ اِس زمین کی زبانوں میں ان کا بتانا ضروری تھا۔ پھر بھی صرف آسان رویا کے سوا وہ کسی کو بھی ایسے لفظوں میں پیش نہیں کر سکتے تھے جو سمجھ میں آ سکے۔

۲۲

خدا کے ساتھ سنگت اور اُس پر بھروسہ

سادھو جی کی زندگی مسیح کے ساتھ گہری رفاقت کی زندگی تھی۔ صبح سویرے خاموشی اور تنہائی میں بیٹھ کر گھنٹوں دعا، گیان، دھیان اور بائبل کے مطالعہ میں گذار دیتے ہیں۔ اپنی مشکلات میں خدا کی راہ دیکھا کرتے تھے۔ وہ ایک مثال یوں بیان کرتے ہیں:۔

ایک دفعہ کوہ ہمالیہ پر گھومتے گھومتے اپنے گاؤں رام پور کنانی جانے کا ارادہ کیا۔ چلتے چلتے ایک ایسی جگہ پہنچے، جہاں دو راستے تھے۔ مجھے بالکل پتہ نہ تھا کہ دونوں میں سے کونسا راستہ رام پور کو جائے گا۔ مَیں ایک پر چلنے لگا۔ بہت دُور جا کر معلوم ہؤا کہ مَیں غلط راستے پر تھا۔ اب اگر واپس لوٹتا تو گیارہ میل پیچھے ہٹنا پڑتا تھا۔ اپنی غلطی پر پریشان تھا۔ ایک پاس کے گاؤں نا تھورا میں آیا۔ وہاں کے ایک دکان دار نے مجھے اشارے سے بلایا۔ جب میں پاس پہنچا تو اُس نے مجھے سنیاسی سمجھ کر ہندی کی انجیل جو اس کے پاس تھی، چھپا دی۔ کچھ دیر گفتگو کرنے کے بعد آخر اس نے مجھ سے یہ سوال کیا کہ "یسوع مسیح کی بابت آپ کا کیا خیال ہے"۔ مَیں نے کہا کہ "وہ میرا مکتی داتا ہے"۔ تب اُس نے بڑے جوش سے جواب دیا۔ کہ "اگر آپ راستہ بھول کر اس جگہ آگئے ہیں۔ تو گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ مَیں بہت عرصہ سے ان انجیلوں کو پڑھ رہا ہوں۔ میرے راستے میں رکاوٹیں ہیں اور دل میں بہت سے شک

ہیں۔ مَیں دعا کر رہا تھا کہ خدا کسی ایسے شخص کو بھیج دے، جو یہ باتیں مجھے صفائی سے سمجھا دے۔ سو خدا میری دعاؤں کے جواب میں آپ کو اِس جگہ لایا"۔ پھر ہم کافی رات تک مسیح کی بابت گفتگو کرتے رہے۔ اگلے دن بھی مَیں اسکے پاس ٹھہرا رہا۔ اُس کے شک دُور ہو گئے۔ اور وہ مسیح پر ایمان لے آیا اور بپتسمہ بھی لے لیا۔ جب ہم پُوری طرح خدا پر بھروسہ کرتے ہیں تو وہ ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ ممکن ہے ہم یہ خیال کر بیٹھیں کہ ہم راستہ بھول گئے ہیں۔ مگر وہ ہمیں ایسی جگہوں پر لے جاتا ہے جہاں ضرورت ہے اور جہاں وہ رُوحوں کو بچا کر اپنی حفاظت میں لے لیتا ہے۔

سُندر سنگھ کے دل میں کامل توکل تھا کہ "خدا ہر حالت میں میرا رکھوالا ہو گا"۔ وہ اپنے تجربات میں سے ایک کا ذکر یوں کرتے ہیں:۔

"ایک آدمی تھا جسے خدا نے پہاڑ پر رہنے والوں کی خدمت سپرد کی تھی۔ جب وہ پہاڑ پر گیا تو پہلے پہل لوگوں نے اسے قبول نہ کیا۔ وہ تھکا ماندہ اور بھوکا پیاسا تھا۔ وہ ایک غار میں جا کر دعا کرنے لگا۔ اس وقت اُس پر یہ آزمائش آئی۔ آزمانے والے نے کہا کہ تم یسوع مسیح کی بابت لوگوں کو تعلیم دینے تو آگئے۔ مگر وہ یسوع ہے کہاں؟ اِس وقت تم بھوکے پیاسے ہو۔ اور تمہارا مکتی داتا تمہاری بات بھی نہیں پوچھتا۔ اس پر وہ پھر دعا کرنے لگا تو اُسے شانتی مل گئی کیونکہ اس کے مکتی داتا نے دعا سُن لی۔ روٹی کی جگہ وہ کچھ میٹھی پتیاں توڑ کر کھانے لگا۔ جن میں ایسا مزہ آیا کہ عمر بھر کبھی کھانے میں بھی نہ آیا تھا۔ خداوند کی موجودگی نے انہیں مزیدار بنا دیا تھا۔

اس کے بعد ایک بڑی بھیڑ لاٹھیاں اور پتھر لے کر اس پر حملہ کرنے آئی۔ اُس نے اپنی آنکھیں بند کر کے کہا "اے خدا تیری مرضی پُوری ہو۔ مَیں اپنی رُوح تیرے سپرد کرتا ہُوں۔" اور آنکھیں کھول کر کیا دیکھا کہ ایک ایک کر کے سب

لوگ چلے گئے۔ اس نے وہ رات دعا میں گزاری۔ صبح کو اسّی نوّے لوگ اُسے دیکھنے آئے۔ اس دفعہ ان کے ہاتھوں میں نہ لاٹھیاں تھیں نہ پتھر۔ اِس آدمی نے کہا کہ اگر تم مجھے مارنا چاہتے ہو۔ تو مَیں تیار ہوں۔ اُنہوں نے جواب دیا کہ کل رات تو ہم ضرور تمہیں مارنے اور پتھراؤ کرنے آئے تھے۔ لیکن اب ایک سوال پوچھنے آئے ہیں۔ ہم نے مُلک مُلک کے لوگ دیکھے ہیں اور اُنہیں خوب پہچانتے ہیں۔ لیکن کل رات تو ہم نے عجیب ہی لوگ دیکھے۔ وہ کہاں کے لوگ تھے؟ کل رات تم اکیلے نہ تھے بلکہ بے شمار لوگ چمک دار پوشاکیں پہنے ہوئے تمہارے چوگرد کھڑے تھے۔ آخر وہ تھے کون؟

یہ سچی رویا ایک یا دو آدمیوں نے نہیں بلکہ تمام بھیڑ نے دیکھی تھی۔ "یہ چمکدار لباسوں والے سُورگی لوگ تھے۔ یہ اُن کی مدد کو بھیجے جاتے ہیں، جو اس کی گواہی دیتے ہیں اور اس کا حکم مانتے ہیں اور جو دُعا عبادت میں لگے رہتے ہیں۔ وہ اس سے بھی بڑھ کر عجیب کام دیکھیں گے۔ اُنہیں ایسا اطمینان ملے گا جو اور کہیں نہیں مل سکتا۔"

لوگ آپ کی تعلیم سُننے کو ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں جمع ہو جاتے تھے۔ مگر آپ کے نزدیک یہ کوئی فخر کی بات نہ تھی۔ یہ اُن کے مالک کی طرف سے تھا اور سب کچھ اُسی کی شان اور جلال کے لیے ہوتا تھا۔ اس کی مثال کے لیے وہ ایک کہانی پیش کیا کرتے تھے اور وہ کہانی یہ ہے:۔

"ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک مانگ کر کھانے والا میراثی مسیحی ہو گیا۔ وہ اپنا دل مسیح کی نذر کر کے دِلی خوشی حاصل کر چکا تھا۔ اِس لیے اس کی گواہی دے سکتا تھا۔ لوگ اکثر کہا کرتے تھے کہ اِس بھکاری میں کچھ ایسی بات ہے جو ہم میں نہیں ہے۔ جب وہ منادی کرتا تو بڑے دھیان سے اس کی بات

سُنی جاتی تھی۔

ایک بار ایک راہی نے پوچھا کہ "یہ لوگ اتنے ادب سے تمہاری باتیں کیوں سُن رہے ہیں؟" میراثی نے جواب دیا کہ جب میرا خداوند گدھے پر سوار ہو کر یروشلیم کو گیا تھا تو لوگ اپنے کپڑے لا لا کر گدھے کے پَیروں تلے بچھاتے تھے۔ وہ لوگ اپنے کپڑے مسیح کے قدموں کے نیچے نہیں بلکہ گدھے کے سُموں کے نیچے بچھا رہے تھے۔ آخر انہوں نے گدھے کی اِتنی قدر کیوں کی؟ کیونکہ بادشاہوں کا بادشاہ اِس گدھے پر سوار تھا۔ جب مسیح اس پر سے اُتر گیا تو کسی نے بھی اس کی پرواہ نہ کی۔ اُس گدھے کی عزت اُس وقت تک ہوئی جب تک شہنشاہوں کا شہنشاہ اُس پر سوار تھا۔"

٢٣

پُرفضل تحریریں

سادھو جی کی شہرت آخری سات سالوں میں کم ہو رہی تھی، لیکن خدا کی بادشاہی کے لیے اُن کی زندگی پہلے کی نسبت کسی صورت میں بھی کم کامیاب نہ تھی۔ جب اُن کی لکھی ہوئی کتابیں اور زندگی کے حالات دنیا کے لوگوں نے پڑھے تو ان کی زندگیوں میں تبدیلی آئی اور وہ زندہ خداوند کے نزدیک آ گئے اور اپنے آپ کو خدا کے ہاتھ میں دے دیا۔ اِسی کو ہم نیا جنم کہتے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند فقرے اِس جگہ درج کیے جائیں جن میں رُوح کی بلندی کا ذکر ہے جو ان کتابوں کے پڑھنے سے ان میں پیدا ہوئی:۔

کینیڈا سے کسی صوبائی اسمبلی کا ایک ممبر لکھتا ہے۔
"مَیں نے دنیاداری اور گناہ میں پھنس کر خدا سے تمام رشتہ توڑ لیا تھا اور بغیر دِلی اطمینان کے زندگی ہولناک معلوم ہوتی تھی، کیونکہ مجھے ایسا نظر آتا تھا کہ خدا نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔ اُس وقت مَیں نے کینن سٹریٹر کی کتاب "دی سادھو" پڑھی جس میں ایک ہندوستانی لڑکا صلیب اُٹھا کر چلتا ہے۔ اس نمونہ نے میرے دل کو ایسا پکڑا کہ اب مَیں خداوند مسیح کا ہوں۔"

فرانس کا ایک نوجوان سادھو جی کی زندگی کا آرمینی زبان میں ترجمہ پڑھ کر کہتا ہے:۔ اب مجھ پر حقیقت روشن ہو گئی کہ سچ مچ رُوحانی زندگی بھی

کوئی چیز ہے اور اس کے مطابق چلنا معنی رکھتا ہے۔ میں اس زندگی کو حاصل کرنے کے لیے مسیح کی غلامی قبول کرتا ہوں۔"

ایک جاپانی مناد نے سادھو جی کی زندگی اور تعلیم پر ایک کتاب لکھی۔ وہ اس کی بابت کہتا ہے کہ "خدا نے اس کتاب کو استعمال کیا اور چھ ماہ کے عرصہ میں اپنی بے حد رحمت سے بھر دیا۔"

آئرلینڈ کی ایک بوڑھی اور بیمار عورت جو مسیح کو خدا نہ مانتی تھی، اُس نے پروفیسر ہیلر کی لکھی ہوئی سادھو سندر سنگھ کی زندگی کا مطالعہ کیا۔ وہ کہتی ہے کہ "اب میں نے دیکھ لیا اور مانتی ہوں کہ مَیں غلطی پر تھی اور اب مَیں جانتی اور مانتی ہوں کہ مسیح خدا ہے۔" اس کے ایک سال بعد پھر کہتی ہے:۔

"آپ پہلے شخص ہیں جنہوں نے مجھے دعا کرنا سکھایا اور آپ کے بیان کو میں نے درست پایا۔ وہ سچ مچ طاقت، خوشی اور دِلی اطمینان عطا کرتا ہے۔ اب تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس کے بغیر مَیں ایک دن بھی زندہ نہیں رہ سکتی۔"

مُلک سویڈن کے شہر اُپسالہ کے مرحوم آرچ بشپ سودربلوم نے لکھا کہ "آپ محبت اور ایمان میں خدا کے وفادار غلام ہیں۔ اُس نے آپ کے وسیلے سے اپنی تمام کلیسیا کو ایک بڑی برکت بخشی ہے۔ میری زندگی میں ایک نہایت قیمتی موقع ہوگا جو مَیں ایک دفعہ پھر آپ کے درشن کرسکوں۔ تاہم اتنے فاصلے پر بھی آپ کی برکت مجھے مدد دیتی، ہمت دلاتی اور طاقت بخشتی ہے۔ جو کچھ خدا نے آپ کی معرفت اپنی کلیسیاء کو اور مجھے عطا کیا۔ میں اُس کا ہمیشہ شکر گذار رہوں گا۔"

جرمنی کے پروفیسر ہیلر صاحب لکھتے ہیں کہ "آپ کے متعلق جو کتاب میں نے لکھی ہے۔ اُس کے ذریعہ بہت سے لوگوں نے خداوند کی برکت حاصل کی ہے۔ آپ کی کتاب نے میرے دل پر گہرا اثر کیا ہے اور میری اندرونی زندگی تازہ ہو گئی ہے۔ ہزاروں انسانوں نے دیکھ لیا کہ یہ کتاب ایک موتی ہے۔ یہی چرچا ہر روز سننے میں آتا ہے۔"

ایک بہن سوئیٹزرلینڈ سے ان کی کتابوں کے بارے میں لکھتی ہے:-

"آپ مجھے خدا کے زیادہ نزدیک لے آئے ہیں۔ غیب کے بھید سمجھنے میں آپ میری بڑی مدد کرتے ہیں اور دعا جس کا مطلب ہے مسیح میں خدا کے ساتھ ہونا، اس کی ضرورت کو محسوس کرنے میں مجھے آپ بہت سہارا دیتے ہیں۔"

اس میں شک نہیں کہ سندر سنگھ کے چھپے ہوئے پیغام پر خدا نے بھاری برکت دی اور ان کتابوں کے ذریعہ بہتوں نے مسیح کے متعلق علم حاصل کیا ہے۔

۲۴

سادھو جی اور ہندوستان کی کلیسیا

سیاسی ہندوستان کی قومیت کو پھلتے پھولتے دیکھ کر سادھو جی کے دل میں جوش پیدا ہوتا تھا، لیکن وہ اپنے خیالات کے اظہار میں حد سے آگے نہ بڑھتے تھے۔ گجرات کے دورہ میں ایک بار گاندھی جی سے ملاقات ہوئی۔ لیکن کسی خاص مضمون پر بات چیت نہ ہوئی۔ مہاتما گاندھی مسیح کی عزت کرتے اور اُس کو خدا کی طرف سے ایک گورو سمجھ کر بڑا درجہ دیتے تھے مگر مسیح گاندھی جی کے نزدیک سب کچھ نہ تھا، جیسا کہ سادھو جی کے نزدیک تھا۔

سادھو جی کی بڑی خواہش تھی کہ ہندوستان کی کلیسیا ہندوستانی ہو جیسا کہ اکثر ہندوستانی مسیحیوں کا بھی خیال ہے۔ پُرانے فرقے جن کی بنا پر مغربی مسیحیت کئی فرقوں میں بٹ گئی ہے۔ سادھو جی کی رائے میں بے فائدہ تھے۔ جس فرقہ کے لوگ خداوند مسیح کی پیروی خلوصِ دل سے کرتے تھے۔ وہ انکے ساتھ مل کر عبادت کر لیتے تھے۔ اُنہوں نے بغیر کسی فرق اور جھجک کے تمام گرجوں میں تعلیم دی۔

سادھو جی عقلی دلائل سے مسیحیت کی تشریح و تفسیر کے خلاف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ آج کل کے نکتہ چین اپنے مذہبی عقیدوں کو عقل سے پرکھنے کے عادی ہیں۔ اُنہوں نے سویڈن میں آرچ بشپ آف اُپ سالا سے کہا۔

"ہم ہندوستانی اُصول اور عقیدے کے غلام نہیں ہیں۔ ہم ان مختلف عقیدوں

سے تنگ آگئے ہیں۔ ہمیں تو زندہ مسیح کی ضرورت ہے۔ ہندوستان کو ایسی ہستیوں کی ضرورت ہے جو نہ محض تعلیم دیں بلکہ ایسے کارگذار ہوں جن کی طبیعتیں اور زندگیاں بھی مسیح جیسی ہوں۔"
بارہ برس ہوئے ہندوستانی مسیحیوں کا خیال تھا کہ مشنوں کا اختیار اور حکم ہماری ترقی کی راہ میں رکاوٹ پیدا کر رہا ہے اور ہم نے مغربی طریقے اور مغربی خیالات اختیار کر لیے ہیں جس کی وجہ سے ہمیں ہمارے اپنوں نے دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال پھینکا ہے۔

جب سُندر سنگھ سادھوانہ لباس پہن کر ایک گروہ کے سامنے آئے تو ایک قوم پرست مسیحی نے لکھا "ہندوستان میں مسیحیت کا مشکل مسئلہ حل ہو گیا۔ جسے سادھو جی نے حل کر دیا۔ سادھوانہ اُصولوں کے آگے ہندوستانی آدمی کا سر جھک جاتا ہے۔ مُدتوں سے ہم یہ سیکھتے چلے آئے ہیں کہ جو آدمی دُنیا کو ترک کرے اور اپنا سب کچھ تیاگ دے وہ اس آدمی سے زیادہ عزت پاتا ہے جو دنیا کو فتح کر کے اس پر حکومت کرے۔"

۲۵

سادھو جی کا آخری سفر

سادھو جی جب آخری دنوں سپاٹو میں تھے تو تبت جانے کے لیے بہت بے چین رہتے تھے۔ مگر صحت کی خرابی کے سبب سفر کرنا ناممکن تھا۔ ۱۹۲۶ء میں آپ نے مجھے کئی بار لکھا کہ "میں ایک بار پھر تبت جانا چاہتا ہوں۔ میری دعا ہے کہ خدا ایک دفعہ پھر مجھے تبت پہنچا دے۔ درد کے دوروں کے باعث تبت جانا ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ میں ضد کر کے خدا کے سامنے سر جھکائے ہوئے ہوں کہ وہ مجھے تبت کے سفر کی اجازت دے دے۔"

اپریل ۱۹۲۷ء میں چند تبتی سوداگروں کے ساتھ رشی کیش سے روانہ ہو گئے۔ درہ نیتی سے گذر کر تبت جانے کا ارادہ تھا۔ ابھی چالیس میل ہی چلے تھے کہ منہ سے خون آنے لگا اور بے ہوشی کی حالت ہو گئی۔ لوگ اُٹھا کر واپس ریلوے سٹیشن تک چھوڑ گئے۔ اگلے سال پھر جانے کی تجویز کی۔ مگر تبتی تاجر کو دوستوں کے انتظار میں دیر ہو گئی اور وقت نکل گیا۔

اگلے سال پھر تیاریاں شروع کر دیں۔ ۱۸ اپریل ۱۹۲۹ء کو ایک تبتی تاجر نے رشی کیش کے مقام پر ملنے کو کہا۔ وہ سپاٹو سے پھر روانہ ہو گئے اور اُسی دن مجھے خط لکھا کہ "آج تبت کی طرف جا رہا ہوں۔ سفر کے خطرے مجھے خوب معلوم ہیں مگر اپنے فرائض کی ادائیگی میں پوری کوشش کرنی چاہیئے۔ میں اپنی جان کو عزیز نہیں سمجھتا کہ اس کی کچھ قدر کروں، بمقابلہ اس کے کہ اپنا دورہ اور وہ خدمت جو خداوند

یسوعؔ سے پائی ہے پُوری کروں۔ یعنی خدا کے فضل کی خوشخبری کی گواہی دُوں۔"

(اعمال ۲۰: ۲۴)

جانے سے پہلے میں آکر آپ سے ملنا چاہتا تھا لیکن ایک تاجر کی چِٹھی آئی ہے۔ اُس میں لکھا ہے کہ تبت کے راستے پر مجھ سے ملو۔ راستہ وہی ہوگا جس کا پچھلے سال آپ سے ذکر کیا تھا۔ جُون کے آخر تک ایک دو تبتی مسیحیوں کے ہمراہ واپس آنے کی امید ہے۔ اگر کوئی حادثہ پیش آگیا۔ تو تھاپا کو آپ کے پاس بھیج کر خبر پہنچا دوں گا۔ اگر میری طرف سے یا میری بابت آپ کو کوئی خبر نہ ملے تو مہربانی سے جولائی میں سباتُو آکر میرے گھر کی سب چیزوں کو سنبھال لیجیے گا۔"

مجھے یاد ہے جب آخری دفعہ اُنہوں نے مجھ سے ذکر کیا کہ جھیل مانسروؔر کے مشرق کی طرف مقام رسادؔ میں مسیحیوں کی چھوٹی سی جماعت ہے جسے دیکھنے کے لیے میرا دل تڑپتا ہے، تو انہیں کچھ ایسے نشان نظر آتے تھے کہ پھر واپس آنا نصیب نہ ہوگا۔ جب ہم یہ باتیں کر رہے تھے تو وہ اِس خطرناک مُہم کے خیال سے جوش میں آکر تھرا اُٹھے، گویا آنے والی سختیوں کے خیال سے کانپ اُٹھے۔ انہیں موت کا کوئی ڈر نہ تھا۔ بلکہ اکثر کہتے تھے کہ رُوحانی دنیا کی شان و شوکت دیکھ کر پھر اس دُنیا میں واپس آنا ایسا ہے، جیسے قید۔"

جب جُون کا مہینہ گذر گیا اور جولائی بھی آدھا نکل گیا اور کوئی خبر ہمارے پاس نہ آئی تو مَیں نے محسوس کیا کہ ہندوستانی کلیسیاء کی خاطر ہم پر فرض ہے کہ ان کا پتہ لگانے کے لیے کچھ نہ کچھ کریں۔ پس جولائی کے آخر میں ڈاکٹر جان۔ سی۔ ٹیلر کے ہمراہ لنڈھور (مسوری) سے اُن کے راستے پر روانہ ہوگیا۔ ہم دونوں پوڑی کی راہ سے سری نگر (گڑھوال) پہنچے۔ پھر گنگا کی گرم وادی سے ہوتے ہوئے

جوشی ناتھ آئے۔ وہاں سے تجارتی سڑک پر ہولیے اور تبت کے سرحدی دیہات کا رُخ کیا۔

اِس جگہ پہنچ کر بڑی ہوتی کے بنجر اور برف سے ڈھکے ہوئے درّہ کی چوٹی پر چڑھنا شروع کیا۔ یہ درّہ اٹھارہ ہزار فٹ کی بلندی پر تبت سے جا ملتا ہے۔ سرحد کی طرف دو سو میل کا یہ سفر سخت مشکل تھا۔ جب ہم واپس آئے تو راستے کے کئی ایک پُل اور سڑکوں کے حصّے بارش کے پانی کے زبردست بہاؤ کے ساتھ بہہ گئے تھے۔ ہمیں بے شمار اُونچے اُونچے پہاڑوں کی خطرناک اُترائی چڑھائی کے راستوں پر سے گذرنا پڑا۔ اگرچہ یہ معمولی دقّتیں تھیں۔ لیکن ان سے ہمیں ان حقیقی خطروں کا کچھ اندازہ ہوگیا، جو سادھو جی کو تبت کے لمبے سفر میں آتے جاتے وقت پیش آیا کرتے تھے۔

حالانکہ اُنہوں نے مجھے یہی راستہ بتایا تھا۔ مگر اُن کے اِس راستے سے گذرنے کا کچھ بھی پتہ نہ چلا۔ کیا جانے کیا ہُوا۔ سری نگر سے چھتّر میل کے فاصلے پر سڑک کے کنارے ایک ہندوستانی منّاد رہتا تھا۔ وہ سادھو جی کا پُرانا دوست تھا۔ جس سڑک سے سادھو کو جانا تھا۔ وہاں سے منّاد کا گھر پچاس گز پر ہے۔ لیکن سادھو یہاں بھی نہ ٹھہرے۔ آخر ہُوا تو کیا ہُوا۔ مئی اور جون میں تمام گنگا کی وادی میں ہیضہ کی وباء پھیلی ہوئی تھی جس میں بدری ناتھ کے بہت سے یاتری مر گئے۔ ان کی لاشیں گنگا میں بہا دی گئیں تاکہ اُس کے پوتر جل سے اُن کی رُوحیں پاک صاف ہو کر سیدھی سُورگ کو چلی جائیں، تو کیا سُندر سنگھ اُن کے ساتھ ہی چل بسے؟ ممکن ہے۔ کیونکہ مرنے والوں کا الگ الگ حساب کتاب نہیں رکھا جاتا تھا۔ ایسی جگہ جہاں بہت سے اجنبی سادھو ہوں ان کی ڈائری رکھنا ناممکن ہے۔ محکمہ صحت کے افسر صرف اتنا درج کر چھوڑتے ہیں کہ

کون کس مرض سے مرا تاکہ آئندہ یہ معلوم ہو سکے کہ کب وباء پھیلی تھی۔ ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ سادھو جی کی آخری گھڑی آ پہنچی تھی۔ اُن کا بدن پہلے ہی نڈھال تھا اور ادھر ہیضہ بھی پھیلا ہُوا تھا۔ اگر وہ بھوٹیا کے گاؤں سے گذرتے جو جوشی ناتھ کے مقام پر یاتریوں کی حد سے پرے واقع ہیں تو اُن کا پتہ آسانی سے لگ جاتا۔ کیونکہ بہت کم لوگ ان گاؤں میں سے ہو کر گزرتے ہیں۔ جو لوگ دروں کی طرف جاتے ہیں، دیہاتی اُنہیں یاد رکھتے ہیں۔

مغربی تبت میں برٹش ٹریڈ ایجنٹ سے اور سپرنٹنڈنٹ شملہ کے ذریعہ پوچھ گچھ کرائی گئی لیکن کچھ بھی پتہ نہ لگ سکا۔

۲۶

سادھو جی اور روپیہ پیسہ!

جب سادھو جی کے پتا شیر سنگھ وفات پا گئے تو کچھ روپیہ اور زمین سادھو جی کے حصّے میں بھی آیا۔ روپے پیسے سے سادھو جی کو ذرا بھی پریم اور لگاؤ نہ تھا۔ پتا کے مرنے کے تین مہینے بعد انہیں معلوم ہُوا کہ مرنے والا اُن کے نام پر کچھ نقد روپیہ اور زمین چھوڑ گیا ہے۔ اُنہوں نے اپنے حصّے کی زمین تو بھائی کے نام کر دی اور نقد روپیہ سے کرسپاٹو میں مکان پر لگا دیا۔

چھاپہ خانوں سے جو روپیہ ان کتابوں کی رائلٹی کے طور پر آتا تھا وہ رفتہ رفتہ کافی بڑی رقم بن گئی۔ اس روپیہ کو اُنہوں نے گورنمنٹ سکیورٹی میں جمع کرا دیا اور بڑی دانائی اور احتیاط سے اُسے خدا کے کام کے لیے وقف کر دیا۔ ۱۹۲۵ء میں انہوں نے ایک وصیت نامہ تیار کیا جس کی رُو سے اُن کی تمام جائداد اور نقد روپیہ کی تقسیم حسب ذیل تین مدوں میں کی گئی:۔

۱۔ اُن مناّدوں کی تعلیم و تربیت اور تنخواہ کے لیے جو تبت اور پہاڑی علاقوں میں جا کر خداوند کی خدمت کریں گے۔

۲۔ اُن جوانوں کو جو بائبل کی اچھی واقفیت اور علم حاصل کریں گے انعامات دیے جایا کریں گے۔

۳۔ دو قسم کے وظیفے مقرر کیے جائیں گے۔ پہلا وظیفہ اُن غریب مسیحی طلبا کو دیا جائیگا جو بائبل کے امتحانوں میں بڑی اُونچی لیاقت دکھائیں گے اور دوسرا وظیفہ

ایسے تجربہ کار اور وفادار منادوں کے لیے رکھا جائے گا جو سیمنری میں تعلیم حاصل کرنے جایا کریں گے۔

چونکہ آپ کی موت کا کوئی پختہ ثبوت نہ مِل سکا۔ اس لیے وصیت کے ذمہ داروں نے عدالت میں درخواست دی کہ سادھو سُندر سنگھ متوفی قرار دیا جائے۔ چنانچہ یکم دسمبر ۱۹۳۲ء کو عدالت نے یہ درخواست منظور کر لی اور وصیت نامہ کی تصدیق کر دی۔

جہاں تک وصیت نامہ کی شرائط اجازت دیتی ہیں، ذمہ داروں کا ارادہ ہے کہ تبت اور پہاڑی علاقوں میں بشارتی کام کے لیے مقررہ رقم کو استعمال کریں چنانچہ یہ تجویز پیش کی جا چکی ہے کہ ایک ایسے آشرم کی سکیم تیار کی جائے جہاں سے منادِ بشارت کے لیے جایا کریں اور آرام کے لیے وہاں واپس آجایا کریں۔ آہستہ آہستہ اِس آشرم کی عمارت دُور پہاڑوں میں جا کر بھی بنائی جائے۔ فی الحال سادھو جی کی کوٹھی واقع سباٹو اس کام کے لیے استعمال کی جائے۔ اُمید ہے کہ یہ آشرم سادھو جی کی اس جانفشانی اور قربانی کی ایک مناسب اور موزوں یادگار بنے گا جو انہوں نے تبت جیسے وحشی مُلک میں اپنے خداوند کی خاطر کی۔

۲۷

جیسا ہم اُنہیں جانتے تھے

جن جن سے ہماری ملاقات ہوئی، اُن میں سے زیادہ لوگ ایسے تھے جن سے سادھو جی نے کہا۔ "زندہ رہنا میرے لیے مسیح ہے اور مرنا نفع" انہوں نے آسمانی رویا دیکھی تھی اور اس کی نافرمانی نہیں کر سکتے تھے۔ بھوک، پیاس اور سردی گرمی میں مسیح کے پیچھے چل کر اس کے دُکھوں میں شریک ہونے کا گُر سیکھ لیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ عجیب بات یہ ہے کہ خدا تکلیف میں خوشی نہیں بخشتا بلکہ ہر تکلیف کو خوشی میں بدل دیتا ہے۔ یہ حقیقت اُن کے حق میں بالکل صحیح ثابت ہوئی۔ انہیں گانا نہیں آتا تھا تو بھی تنگی، دُکھ درد اور ایذا کی حالت میں یکایک خوشی کے جوش میں گاتے تھے اور اپنے دکھ دینے والوں کو اپنی خوشی سے حیرت میں ڈال دیتے تھے۔

سادھوانہ زندگی جو انہوں نے اختیار کی تھی اُسے انہوں نے زندگی کی معمولی باتوں سے اُونچا کر دیا اور خداوند کی خوشی اور اطمینان سے بھر دیا تھا۔ لمبے روزے نے دنیا کی چیزوں کی قدر اور شان کم کر دی تھی۔ اب وہ جلال کے وارث تھے۔ کیونکہ انہوں نے اپنے خداوند کی موجودگی اور نزدیکی کا کامل طور سے تجربہ کر لیا تھا۔

سادھو جی ایک ایسے مزاج کے انسان تھے کہ جس نے دیکھا، ان کا گرویدہ ہو گیا۔ حلیم اور سیدھا سادا انسان، سفر اور یاترا کی کامیابیوں اور دنیا بھر کی شہرت

نے ان پر کوئی اثر نہ ڈالا تھا، ہنس مکھ اور ظرافت پسند بھی تھے۔ اُسی وقت بولتے تھے، جب کوئی انہیں مخاطب کرے۔ مگر گفتگو میں ماہر تھے۔ آخری دنوں میں فلسفہ کی کتابوں کے مطالعہ کے عادی ہو گئے تھے۔ اس کا پتہ ان کی نشان کی ہوئی کتابوں سے چلتا ہے۔

وہ اکثر حیران ہوتے تھے کہ خدا نے ان جیسے آدمی کو بھی ایسے بڑے بڑے کاموں کے لیے بلایا ہے۔ ان کو اس بات سے تعجب ہوتا تھا کہ جب انہیں دولت کا خیال تک بھی نہ آیا تو خدا نے دولت بھی دے دی!

کبھی کبھی ہنسی خوشی کی گفتگو کو عین بیچ میں چھوڑ دیتے تھے اور چپکے سے اجازت لے کر مقررہ وقت پر اپنے خداوند سے ملاقات کے لیے کمرے میں چلے جاتے تھے۔ صبح سویرے ہی اُٹھ بیٹھتے۔ خدا کے کلام کے مطالعہ سے اور زندہ خداوند کی شراکت سے دِلی تسکین حاصل کرتے اور رُوح کو تر و تازہ کر کے دِن کا کام شروع کر دیتے تھے۔

ہندوستان کی کلیسیا کے لیے سُندر سنگھ نے کیسی عجیب شہادت چھوڑی ہے۔ دُکھ اُٹھا اُٹھا کر وہ ایسے کامل ہو گئے تھے کہ ان کے چہرے کی خوشی اور خاموشی ہر ملنے والے کے دل میں اُن کی بزرگی اور رُوحانی بلندی کا یقین بھر دیتی تھی ؛